پرواز لق

مزاحیہ افسانوں اور ماڈرن غزلیات کا مجموعہ

از

حاجی لق لق

کتابستان۔ 60 سروجنی مارکیٹ نیو دہلی

قیمت :- دو روپے آٹھ آنے

کھنہ لتھو پریس دہلی

سول ایجنٹ

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

انتساب

میں اپنی اس حقیر تصنیف کو نواب
سر محمد شاہ نواز خاں والئے ممدوٹ
کے
اسم گرامی کے معنون کرتا ہوں۔

نیاز مند
حاجی لق لق

فہرس

۱- فلمستان سے قبرستان تک ۹
۲- تین خواب ۱۷
۳- منشی جی ۲۳
۴- فلم کی گواہی ۲۹
۵- پری استھان ۴۰
۶- فلم ایکٹرس کی ڈاک ۵۲
۷- زندہ ناچ وگانا ۶۱
۸- فلمی غزل ۶۹
۹- فلمی ادب کثیف ۷۱
۱۰- چار سو بیس ۷۳
۱۱- چونگی خانہ ۸۱
۱۲- ماڈرن غزل نمبر۲ ۸۷
۱۳- ماڈرن غزل نمبر۳ ۸۸
۱۴- وہ آگئیں ۸۹
۱۵- ادب کثیف ۹۳
۱۶- شادی ایجنسی ۹۵
۱۷- ماڈرن غزل نمبر۴ ۱۰۱
۱۸- ماڈرن غزل نمبر۵ ۱۰۱
۱۹- بھلے کے سینڈل ۱۰۲
۲۰- ادب کثیف ۱۰۸
۲۱- ماڈرن غزل نمبر۶ ۱۱۰
۲۲- ماڈرن غزل نمبر۷ ۱۱۰
۲۳- جنوں کی شرارت ۱۱۲
۲۴- ماڈرن غزل ۱۱۸
۲۵- میری پہلی شرارت ۱۱۹
۲۶- حاجی لق لق کا اغوا ۱۲۳
۲۷- ٹھگی ۱۲۹
۲۸- پیرس کی ہولی ۱۳۵
۲۹- جنگجو قومیں ۱۴۰
۳۰- ادب کثیف ۱۴۵
۳۱- ماڈرن گیت ۱۴۶
۳۲- انتخاب اسمبلی اور فلم ۱۴۷
۳۳- فلمی زادیئے ۱۵۲

پیش لفظ

(از مصنّف)

مزاح نویسی ایک ایسا انداز تحریر ہے کہ لکھنے والا ظرافت کے پردے میں بہت کچھ باتیں کہہ جاتا ہے اور ہنسی مذاق کی گفتگو میں اصلاحی خدمت انجام دے سکتا ہے

اس سے پہلے راقم التحریر کی تین کتابیں مزاحی نثر میں شائع ہو چکی ہیں اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ باذوق عوام نے میری تحریروں کی قدر کی اور میری حوصلہ افزائی فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے اپنی چوتھی کتاب " پرواز لق لق " کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرنے کی جرأت ہوئی ہے۔

دراصل یہ مضامین فلمی دنیا کے متعلق تھے۔ فلمی دنیا بہت دلچسپ عالم ہے۔ اور اس کی دلچسپیوں کو اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے اور پر مزاحی رنگ میں روشنی ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور اس سے بہت سے اصلاحی فوائد مرتب ہو سکتے ہیں۔ آپ اس کتاب میں فلم ایکٹرسوں کی ڈاک دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان مضامین سے میرا مطلب کیا ہے محض ہنسنا ہنسانا یا اصلاح۔

چونکہ اس کتاب کے پبلشرز میسرز کتابستان اردو کو کاروباری وجوہ کی بنا پر اس کے چھاپنے میں عجلت درکار تھی۔ اور فلمی مضامین اتنے کافی نہ تھے کہ پوری کتاب بن سکے۔ اس لئے میں نے ان کے ساتھ دوسری قسم کے مضامین بھی شامل کر دیئے۔ اور پبلشرز خوش ہیں کہ ان کی اور میری مجبوری نے " پرواز لق لق " کو صرف فلمی مضامین تک

ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کتاب ایک دلفریب گلدستہ بن گئی ہے اور اس میں مختلف النوع مضامین آ گئے ہیں۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ مضامین پسندیدہ ہیں یا نہیں یہ دیکھنا قارئین کا کام ہے بہر حال مجھے توقع ہے کہ جہاں میری تصانیف نے میرے لئے دنیائے ادب میں ایک خاص مقام پیدا کر دیا ہے۔ وہاں اس ناچیز کتاب سے بھی میرے حوصلوں میں اضافہ ہوگا۔

میں ادیب ہونے کا دعویدار نہیں۔ محض دنیا کے کھیل کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہوں اور اپنے رنگ میں حقائق و واقعات پر تبصرہ کر دیتا ہوں۔ امیدؔ ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کے مطالعہ کے وقت اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں گے۔

ناچیز

حاجی لق لق

فلمستان سے قبرستان تک

حاجی لق لق نے ذیل کا مضمون دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اسے ڈائرکٹر صاحب دہلی ریڈیو اسٹیشن کی اجازت سے شایع کیا جاتا ہے۔

پبلشرز

یہ دنیا آنی جانی ہے اور کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ :-

ایک آتا ہے ایک جاتا ہے
ایک ریڈیو پر گنگناتا ہے

موت ہر شخص کو آتی ہے اور صرف ایک بار آتی ہے لیکن اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہیں بار بار موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے مثلاً شاعر حضرات دیکھیے صبح ہوئی اور یہ کفن باندھ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے یہاں مرے وہاں مرے ادھر مرے اُدھر مرے۔ غرض مرتے مرتے سورج غروب ہو گیا اور سر شام قبر میں جا پہنچے۔

رات لحد میں آہیں بھرتے اور شعر پڑھتے پڑھتے گذر گئی۔ علی الصبح کوئی شوخ ستم گر اپنی مستانہ چال سے فتنہ محشر بپا کرتا ہوا آ نکلا اور اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے قبر کو مرآداباد بنا دیا۔

اس کے بعد پھر وہی "مردن" کی گردان شروع ہو گئی۔ مرگِ متواتر کے اس کے لا متناہی سلسلہ کو دیکھ کر یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ شاید شاعر صاحب مُردہ ہی پیدا ہوئے تھے اور اب اچھا خاصا چلتا پھرتا جنازہ ہیں۔

دوسرا "سدا موت" گروہ فلم ایکٹروں کا ہے جنہیں پردہ سیمیں پر ہوتے ہوئے اول تو موت آتی ہی نہیں اگر خدانخواستہ کوئی ایکٹرانا ہو بھی جائے اور اس کی فلمی بیوی اس کے سرہانے بیٹھ کر سندھی بھیروی میں نوحہ خوانی شروع کر دے تو دفعتہً ایک دراز ریش اور مقدس صورت فقیر مہاتما "موقع واردات" پر آ نکلتا ہے اس کا دل بیوہ کی پُرسوز نگر" باساز "گریہ وزاری" پر پسیج جاتا ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے زیر لب کوئی کلام پڑھتا ہے۔ جس سے مُردہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی موت کسی دوسرے موقع پر ملتوی ہو جاتی ہے۔

موت کے ساتھ کھیلنا اور مر مر کے جینا ایکٹروں کے لئے کچھ ایسا روز کا دھندا ہو جاتا ہے کہ جب کسی ایکٹر کو حقیقی موت آتی ہے تو وہ بھی نقلی موت کی طرح رواروی ہی میں گذر جاتی ہے۔ اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے ایکٹنگ فرمایا ہے اور اگر جوار رحمت میں جانے والے بزرگوار کے تیمار دار بھی ایکٹر ہوں، تو کیا ہی پوچھتے ہو۔ غریب کی موت ایکٹنگ اور اس کا بستر مرگ اداکاری کی درسگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک واقعہ سنئے کہ ایک مرحوم ایکٹر پر فلمستان سے قبرستان تک

کیا کیا گذری۔

میر صفدر نے دنیا کے فلم میں ایک معمولی اداکار کی حیثیت سے قدم رکھا تھا اور رفتہ رفتہ کمال فن کو پہنچ کر ایک نئی فلم کمپنی کے ڈائرکٹر بن گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے سر پر وہ دن آ پہنچا جب انہیں اپنی زندگی کے دلچسپ ڈرامے کا آخری ایکٹ کرنا تھا۔

میر صاحب کی کوٹھی جس میں دوسرے ایکٹر بھی رہتے تھے شہر سے دور تھی اس لئے اس آخری وقت ان کے پاس صرف تین چار ایکٹر ہی موجود تھے باقی ایکٹر سٹوڈیو میں تھے جہاں نئی فلم کا شوٹنگ ہو رہا تھا۔

میر صفدر کی آخری گھڑیاں آ پہنچیں چہرہ پر مردنی چھا گئی، ہونٹ نیلے پڑ گئے آنکھیں بے نور ہونے لگیں اور دم رکنے لگا۔ مرزا نذیر نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں پر رومال رکھ کر خوب روئے اور جب طبیعت ذرا سنبھلی تو آہ بھر کر بولے کیا حقیقت برس رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موت سچ مچ سامنے کھڑی ہے۔

مرزا صاحب نے یہ لفظ کہے ہی تھے کہ میر صاحب کا سانس اکھڑنے لگا اور گھنگرو بولنا شروع ہوا۔ مرزا نے پلٹ کر آواز دی خوشیا۔ خوشیا اپنے نور اسٹوڈیو میں جاؤ اور مسٹر چندر کو بلا لاؤ انہیں کل جان کنی کا پارٹ ادا کرنا ہے اس لئے ذرا آنکھوں دیکھ لیں کہ نزع کی حالت کا ایکٹنگ کس طرح کرنا چاہیئے موٹر لیجاؤ جلدی۔

خوشیا سٹوڈیو کی طرف روانہ ہو گیا اور قادر لپک کر طاقچہ سے ایک

خالی گلاس اٹھا لایا۔ مرزا بولے کیا کر و گے ؟ قادر نے کچھ جواب نہ دیا اور گلاس کو جھکا کر مرزا کے لبوں سے لگا دیا۔ مرزا نے کہا اجی یہ تو خالی ہے قادر نے کہا میں جانتا ہوں لیکن فنی نقطہ نظر سے اس کا (EFFECT) تو دیکھئے فرض کیجئے کہ کوئی شخص اس پردے کے پیچھے اس منظر کو شوٹ کر رہا ہے تو میرے اس ایکٹنگ کے بغیر یہ سین پردے پر جا کر کیا ہی ادھورا نظر آتا کہ جاں بلب مریض کے پاس چار آدمی بیٹھے ہیں۔ لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس کے منھ میں پانی ٹپکا دے۔

مرزا نذیر بولے شاباش بیٹا شاباش سچ پوچھو تو میرے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہ تھی۔ انتیاز نے قادر کی فراست کی تعریف سن کر پاس کی الماری کھولی اس میں سے انگریزی کی ایک کتاب نکالی۔ اسے کھول کر مریض کے سرہانے بیٹھا سر ہلا ہلا کر اس طرح لب ہلانے لگا کہ گویا سورۃ یٰسین کی تلاوت کر رہا ہے۔ مرزا نذیر بول اٹھے واہ بھئی انتیاز واہ۔

خوب سوجھی اب سین مکمل ہے۔

میر صفدر کی شمع حیات گل ہو رہی تھی کہ مسٹر چندرا بھی آپہنچے اور ایک طرف کھڑے ہو کر جان کنی کا منظر دیکھنے لگے۔ دفعتہً مریض نے ایک لمبی سانس لی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

مرزا نذیر نے نعش کے چہرے پر چادر ڈال دی اور دونوں کو تجہیز و تکفین کے متعلق ہدایات دینے لگے۔ "مسٹر چندرا کو سٹوڈیو بھیجا تھا لیکن وہ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔" مرزا نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر نگاہ

کی تو مسٹر چندرا وہاں آئینے کے سامنے میر صفدر کی جان کنی کی نقل اتار رہے تھے۔

الغرض میت کو غسل خانے میں لیجا کر غسل دیا گیا اور تھوڑی دیر میں جنازہ تیار ہو گیا۔ سٹوڈیو سے باقی ایکٹر بھی آ گئے جو شوٹنگ میں مصروف ہونے کے سبب سے مختلف کریکٹرز کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور گھبراہٹ میں کپڑے بدلنا بھول گئے تھے۔

جنازہ اٹھا اور ایکٹر اس کے پیچھے ہو لیے کوئی شاہی خلعت پہنے تھا اور کوئی ڈاکو کا لباس۔ کسی نے سپاہی کی وردی زیب تن کر رکھی تھی اور کسی نے دیہاتی کپڑے کسی کی ڈاڑھی نقلی تھی اور کسی کی مونچھیں مصنوعی۔ غرض یہ جلوس جنازہ اس طرح نظر آ رہا تھا گویا ہولی کا سوانگ جا رہا ہے۔

قبرستان پہنچے تو مرزا کو یاد آیا کہ جنازہ پڑھانے کے لیے امام کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جنازہ کو قبرستان کے پاس رکھ کر ایک آدمی دوڑا دیا گیا کہ تانگہ لے جا کر شہر سے کسی مولوی صاحب کو لے آئے۔

تو قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد مولوی صاحب کو لے کے آیا اور مرزا نذیر نے جب دور سے تانگہ دیکھا تو کہا ارے بھئی مولوی صاحب آ رہے ہیں ذرا قطار باندھ کر بیٹھ جاؤ تاکہ مولوی صاحب ہمیں ایکٹر ہی نہ سمجھیں۔

سب لوگ سیدھے ہو گئے اور ایک سیدھی قطار باندھ کر اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے جب مولوی صاحب تانگے سے اتر کر پاس آئے تو قطار کی طرف نگاہ حیرت سے دیکھ کر چلا اٹھے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

اجی حضرات یہ کیا بوالعجبی ہے کہ آپ کے منہ قطب کی سمت ہیں؟ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ قبلہ کس جانب ہے؟

یہ سب لوگ کھسیانے سے ہو گئے اور مرزا نذیر جھٹ بول اٹھے اجی مولوی صاحب معلوم تو سب کچھ ہے۔ صرف آپ کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس لئے جدھر منہ ہوگیا بیٹھ گئے۔

مولوی صاحب نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور کہا میں وضو کرنا چاہتا ہوں آپ نے وضو کہاں کیا ہے؟ یہ سوال ایکٹروں کے لیئے دوسری آفت تھی اب کسی نے وضو کیا ہو تو بولے۔ مرزا نذیر نے اس بات کو بھی ٹال دیا۔ اور لگے چاروں طرف دیکھنے۔ حسن اتفاق سے ذرا فاصلے پر ایک کنواں نظر آیا۔ مولوی صاحب اس طرف چل پڑے اور ایکٹر اپنے دو آدمی میت کے پاس چھوڑ کر ان کے پیچھے ہو لیئے کنوئیں کے پاس پہنچ کر مولوی صاحب نے وضو کیا۔ اور ایکٹر غور سے وضو کی ترتیب دیکھتے رہے تاکہ وہی ایکٹنگ دہرا سکیں۔ مولوی صاحب فارغ ہو چکے تو سب نے ان کے وضو کی نقل اتاری اور جنازے کے پاس واپس آئے۔ پھر باقی دو آدمیوں نے کنوئیں پر جاکر ایک دوسرے کے مشورے سے وضو کیا۔

جب یہ مرحلہ طے ہو چکا تو مولوی صاحب نے قبلہ رو ہو کر جنازہ کو سامنے رکھوایا۔ ایکٹروں نے جھٹ ان کے پیچھے قطار باندھ لی اور نماز جنازہ شروع ہو گئی۔ لیکن جب مولوی صاحب نے دوسری تکبیر کہی تو کئی مقتدی قیام کی حالت سے رکوع میں چلے گئے۔ اور دو تین براہ راست سجدے میں گر گئے۔

مولوی صاحب نے نماز جاری رکھی۔ اور جب سلام پھیر چکے تو بولے

بھایئو مجھے آہٹ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے رکوع و سجدہ بھی کیا ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ اور بالآخر مرزا نذیر نے کہا مولوی صاحب یہ صحیح ہے۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ ہم میں سے کسی کو بھی اس سے پہلے نماز جنازہ پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بہرحال آپ یہ فرمایئے کہ ہماری نماز جنازہ ہوئی بھی ہے یا نہیں۔

مولوی صاحب اپنی داڑھی کو کھجانے لگے اور چند لمحوں تک غور کرنے کے بعد بولے میں نے اس مسئلہ کے متعلق فقہ کی مشہور کتاب "نجات المومنین" میں کچھ پڑھا تو ضرور ہے لیکن کمبخت حافظہ بہت کمزور ہے اور بدقسمتی ہے میں کتاب بھی ساتھ نہیں لایا۔ بہرحال اگر نماز نہیں ہوئی تو پرواہ نہیں کتاب دیکھنے کے بعد کل غائبانہ جنازہ پڑھا دوں گا۔

یہ کہہ کر مولوی صاحب نے دعا مانگی اور اس کے بعد میّت کو دفن کر دیا گیا۔ جب چلنے کی تیاری ہوئی تو مرزا نذیر نے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کا حق خدمت کل آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ کیونکہ اول تو نماز جنازہ کا معاملہ بھی مشکوک ہے۔ شاید کل آپ کو پھر تکلیف دی جائے اور آپ کے پیسے بڑھ جائیں دوسرے یہ کہ آپ کا معاوضہ کمپنی کے دفتر سے ملے گا۔

مولوی صاحب پر کمپنی کے نام کا رعب چھا گیا اور وہ سلام علیکم کہہ کر گھر کو روانہ ہوئے راستہ میں سوچتے جاتے تھے کہ کیا ملے گا اگر دس روپے ہوئے اور اتنی بڑی کمپنی کے لیے دس روپے کی کوئی بات نہیں تو ان کا مصرف کیا ہو گا۔ ایک تو ہم اپنے لئے پگڑی خرید یں گے۔ ایک ننھے کی والدہ کے لئے قمیص بنائیں گے۔ اور جوتا ننھے کو بھی چاہیئے۔ باقی ادھر ادھر کام آئیں گے۔

اگلے دن نیو موٹر کار میں بیٹھ کر مولوی صاحب کے گھر پہنچا۔ اور ان کے ہاتھ میں لفافہ دیکر ہوا ہو گیا۔ مولوی صاحب چلاتے ہی رہے کہ بھئی کل والی نماز جنازہ نہیں ہوئی۔ لیکن موٹر نظر سے غائب ہو گئی۔

مولوی صاحب نے لفافے کو ٹٹولا اندر سے نوٹوں کی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے گھر کے اندر جا کر اور کنبے کو جمع کر کے لفافہ کھولا۔ لفافہ میں سے جو کچھ نکلا اسے پلٹ کر دیکھا تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یہ نیک پیپر کے لیٹر فارم پر لکھا ہوا ایک اُردو مکتوب تھا لکھا تھا۔

مولوی صاحب قبلہ!

آپ کی تکلیف کا شکریہ آپ نے کمپنی پر بہت احسان فرمایا ہے۔ ہم آپکا حق خدمت کیا دے سکتے ہیں۔؟ بہرحال ایک مقامی سینما ہال سے سیکنڈ کلاس کا پاس خاص طور پر آپ کے لئے منگوا کر بھیجا جاتا ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔"

اس چٹھی کے ساتھ سبز رنگ کا ایک ٹکٹ منسلک تھا۔ مولوی صاحب نے اسے بڑے غصے کے ساتھ زمین پر پھینک دیا اور کہا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

تین خواب

ہمارے گھر کے قریب ہمارے دوست مسٹر بی۔ اے شیخ رہتے ہیں جو ریڈیو مشینوں کی تجارت کرتے ہیں اور بیڈن روڈ پر" مارکو" کے نام سے ان کی ایک عالیشان دوکان بھی ہے۔ شیخ صاحب کے گھر پر بھی ریڈیو مشین لگی ہوئی ہے۔ اور جب رات کوئی اچھا پروگرام ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بلا لیتے ہیں۔

کل رات ہم کچھ تو دس بجے تک مسٹر شیخ کے ہاں ریڈیو سنتے رہے۔ اور کچھ گھر جاکر عید کی بچی ہوئی سیویاں زیادہ مقدار میں کھا بیٹھے۔ اس لئے نیند نے ہمیں ایک دم آلیا۔ اور بیدار ہوئے تو ایسے زمانہ میں جبکہ سینما کی دنیا میں انقلاب روس برپا ہو چکا تھا۔ یعنی وہ ایجاد ہو چکی تھی جس کا ذکر ہم سے مسٹر شیخ نے کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آئندہ سینما میں ہر ایسی چیز کی اصلی خوشبو بھی تماشائیوں کے دماغ تک پہنچا کرے گی۔

ہم نے دیکھا کہ ہم ایک سینما ہال میں بیٹھے ہیں۔ ہال تماشائیوں سے کھچا

پھر کیا ہے لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ پہلا "خوشبودار فلم" ہے جو لاہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی ناک صاف کی تاکہ فلم کی خوشبو کسی رکاوٹ کے بغیر ہمارے دماغ شریف تک پہنچ سکے۔

گھنٹی بجی۔ بتیاں گل ہوگئیں۔ اور پردہ پر سب سے پہلے اشتہارات دکھائے جانے لگے۔ عطریات کی ایک دوکان کا منظر دکھایا گیا۔ انواع واقسام کی خوشبوؤں سے ہال مہک اٹھا۔ عطر حنا کی خوشبو روغن آملہ کی خوشبو۔ خوشبودار سپاریوں کی خوشبو وغیرہ اوپر لکھا تھا۔ سب سے عمدہ۔ خالص اور سستے عطر و روغن کے لیئے مسلم بھائیوں کی دوکان واقعہ کشمیری بازار پر تشریف لایئے اس کے بعد پھلوں کی ایک دوکان سامنے نظر آئی کبھی سیب کی خوشبو دماغ سے ٹکراتی، کبھی رنگترے کی خوشبو سے منہ میں پانی بھر آتا اور جب ایک خاص قسم کے آموں کی خوشبو دوسری خوشبوؤں پر غالب آگئی تو ہم نے دیکھا کہ سالک صاحب یہ کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔

"چراغ الدین کی دوکان تک جاتا ہوں۔"

اشتہارات ختم ہوئے تو کہانی شروع ہوگئی۔ بڑی دلچسپ کہانی تھی۔ اور ہم حیران تھے کہ ہندوستانی ایکٹر ایکٹنگ اور دیگر خوبیوں میں کسقدر ترقی کر چکے ایک عورت کا بچہ مرگیا اور ہم نے دیکھا کہ اس نے بچے کی لاش پر کوئی گانا نہیں گایا۔ باغ کا سین آیا تو پھولوں کی خوشبو سے ہال مہک اٹھا۔ سڑک پر سے چھڑکاؤ کی مشین گذری تو مٹی کی بھینی بھینی بو باس سے دماغ معطر ہوگیا۔

آگے چل کر میخانے کا ایک سین سامنے آیا۔ وسکی کی بو ہر طرف پھیل گئی اس پر چند دیندار مسلمان پکار اٹھے۔ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" شرم شرم کے آوازے

کسے جانے لگے۔ نعرہ تکبیر بلند ہوا اور ایک باریش بزرگوار نے جو کسی اخبار کے ایڈیٹر معلوم ہوتے تھے کھڑے ہو کر کہا۔ مسلمانو! یہ ہمارے دماغ میں ایک بوتے حرام کی مداخلت بے جا ہے۔ ہم کل اس کے خلاف اپنے اخبار میں احتجاج کریں گے۔ اگر تم میں کچھ بھی غیرت کا مادہ ہو تو فوراً واک آؤٹ کر جاؤ۔

یہ کہہ کر ایڈیٹر صاحب دروازے کی طرف چل پڑے اور سب مسلمانوں نے مختلف درجہ کی قطاروں سے اٹھ اٹھ کر ان کی متابعت کی۔

تھوڑی دیر فلم چلنے کے ایک ہوٹل کا نظارہ پیش نظر ہوا۔ جس میں کئی آدمی بیٹھے سگار پی رہے تھے کمرہ تمباکو سے دھوئیں دھار ہو رہا تھا۔ اور تمباکو کی خوشبو سارے ہال میں پھیل گئی۔ یہ بات دیکھ کر سکھ تماشائیوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور وہ فلم والوں کو گالیاں سنانے لگے۔ ایک سکھ اٹھ کر "جو بولے سو نہال" پکارا۔ اس پر سب سکھوں نے "ست سری اکال" کا نعرہ لگایا اور سینما ہال پر پکٹنگ لگانے کی دھمکیاں دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ہم نے نہ مسلمانوں کا ساتھ دیا نہ سکھوں کا۔ بلکہ انٹی کمیونل لیگ کے ممبروں کی طرح اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ فلم دیکھنے میں مشغول رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ کسی ایکٹر کی ہوا خارج ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہال میں ہر طرف سخت بدبو پھیل گئی ہم نے اپنی ناک دبالی۔ لیکن جب ہاتھ اٹھایا تو بدبو بدستور موجود تھی اور اس قدر تیز تھی کہ ہمارا جی متلانے لگا۔ ہم ناک دبائے ہوئے باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ لیکن ایک کرسی سے اٹک کر دھڑام سے زمین پر گر گئے۔

آنکھ کھلی تو ہم اپنے بستر پر تھے اور پیٹ میں بیویاں ابل رہی تھیں۔

ہم نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر سو گئے۔

دوسرا خواب

آپ کو بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ بعض اوقات تھوڑے سے وقفہ بیداری کے بعد خواب مسلسل چلتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ ابکے ہم سوئے تو ایسے زمانہ میں جاگے جب کہ سینما مفقود ہو چکے تھے اور ٹیلی وژن مروّج ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک دوست لالہ کرم چند مدیر پارس کے مکان پہ پایا۔ دیوار پہ ایک سفید چادر تنی رہی تھی۔ اور اس پر ہندوستان بھر کے مختلف واقعات نظر آرہے تھے ہندوستان کو ابھی تک "سوراج" نہیں ملا تھا۔ اس لئے کانگریس کا جلسہ بڑی دھوم دھام کے ساتھ احمد آباد میں ہو رہا تھا۔ ہم نے اس جلسہ کو اپنی آنکھوں سے چادر پر دیکھا۔ سوشلسٹ۔ ایکسٹرمیسٹ ماڈریٹ اور دیگر پارٹیوں کے لیڈر بحث میں مشغول تھے۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا۔ کہ ۱۹۲۹ء کی طرح پھر مکمل آزادی کا اعلان کیا جائے۔

اس کے بعد مسلم لیگ کا جلسہ سامنے آیا جو علی گڈھ میں ہو رہا تھا۔ صدر کو کرسی سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا گیا۔ سیکرٹری کو مار مار کر پنڈال سے باہر نکال دیا گیا۔ "ہم ہجرت کریں گے۔" "ہم ہجرت کریں گے۔" کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور ایک ہنگامہ بپا تھا۔

اس کے بعد ایک ڈرامہ شروع ہوا۔ جو بمبئی میں ہو رہا تھا لیکن ہم اسے پورا دیکھ نہ چکے تھے کہ نیند کھل گئی۔

ہم بیدار ہوئے تو پھر اسی چارپائی پر تھے۔ لیکن اس دفعہ سویاں ہضم ہو چکی تھیں اور پیٹ کو چند منٹ بیدار رہنے کے بعد پھر ہم پر نیند غالب آگئی۔

تیسرا خواب

یہ تیسرا خواب بہت مختصر مگر حسرت ناک تھا۔ آنکھ لگتے ہی انار کلی بازار میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ سامان خورد و نوش کی دوکان موجود نہیں بلکہ یوں کہیے آلات سائنس اور ان ادویہ کے سوا جو سائنس دار التجارت میں کام آتی ہیں یا کھانے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اور کوئی دوکان موجود ہی نہیں۔ ہمارا دل پان کھانے کو چاہا۔ اور ہم آگے بڑھے لیکن پان کی کوئی دوکان نظر نہ آئی تھی۔ محمد شفیع کی سرائے کے پاس جس کے باہر "گورنمنٹ ریڈیو سٹیشن" کا بورڈ آویزاں تھا۔ ہمیں ایک دوست مل گئے جو ایک ماہانہ ادبی رسالہ کے ایڈیٹر تھے علیک سلیک کے بعد پوچھنے لگے "کہاں پھر رہے ہو۔؟" ہم نے کہا کہ پان کی تلاش کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے ہماری طرف بڑی حیرت سے دیکھا اور کہا سوتے ہو یا جاگتے۔ کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔؟ "پان کی دوکانیں ہوتیں تو چند سال سے ہمارے سالنامے کیوں پھیکے رہتے۔؟ جب پان فروش موجود ہوا کرتے تھے تو ہم کسی نہ کسی آراستہ دوکان سے کسی خوبصورت نیم برہنہ معشوق کی تصویر خرید لیتے تھے۔ اور بلاک بنوا کر اس سے اپنے سالنامہ کی زینت بڑھاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ پان والے اس قسم کی تصاویر بڑی محنت سے تلاش کر کے ان سے اپنی دوکانیں سجایا کرتے تھے لیکن آہ وہ زمانہ گیا۔ اب تو تصویر کا ملنا ہی ناممکن ہو گیا۔

خواب بھی عجیب چیز ہے یا تو ہم ان ایڈیٹر صاحب کی حسرتناک گفتگو سن رہے تھے۔ اور یا ہم ایک لمحہ میں دہلی کے فتحپوری بازار میں پہنچ گئے سامنے خواجہ حسن نظامی صاحب آ رہے تھے، ہم نے نیاز مندانہ آداب عرض کیا۔ اور پوچھا قبلہ

کیا سینما گھر کے ارادے ہیں۔ ۔؟" خواجہ صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ سینما۔؟ کا نام تک باقی نہیں رہا یہ نام کئی سال کے بعد تمہاری زبان سے سن رہا ہوں میاں سینما کی کیا ہی بات تھی۔ پاس گھر پر آجاتے تھے اور شام کے وقت اچھی تفریح ہو جاتی تھی۔ منادی میں ایکٹرسوں کے "فلمی چہروں" اور "نذکار جمیل" سے زندگی پیدا ہو جاتی تھی لیکن آج کل تو بے مزہ گزرتی ہے۔ اس سائینس کے حق میں کہاں تک بد دعا کروں۔ خدا سے ......"

خواجہ صاحب یہیں تک کہنے پائے تھے کہ ہمارے کان میں آواز آئی آج اٹھو گے نہیں نو بج گئے کیا آج دفتر نہ جاؤ گے۔؟" ہم نے آنکھیں کھولیں تو ہماری محترم بیگم صاحبہ ہمارے سرہانے کھڑی تھیں۔؟"

منشی جی

افرادِ تمثیل

جے جے کانیتا	فلم ڈائرکٹر
رنگین جہاں گیرپوری	مکالمہ نویس بمشاہرہ ۳۰۰ روپے
اندر	مشہور سٹار بمشاہرہ ۸۰۰ روپے
رستم کیکا ؤس جی	مالک فلم کمپنی ۔

کیمرہ مین، ساؤنڈ ریکارڈر، آرٹسٹ وغیرہ۔

ایک نئے فلم "ستا سنسار" کا شوٹنگ ہورہا ہے راج پال اور مس کنا ری بائی عاشق و معشوق کا پارٹ ادا کرنے کے لئے کیمرہ کے سامنے آتے ہیں۔ کیمرہ مین "ریڈی" کا حکم دیتا ہے۔ کیمرہ اور آلہ صورت بندی کھول دیا جاتا ہے اور ایکٹ شروع ہوتا ہے۔

فرخ (اندر) پیاری تم نہیں جانتی ہو کہ میں تم سے کس قدر موہوت رکھتا ہوں۔

آہ! میری جان!

شمسہ (مس کناری بائی) میں تمہاری فریب باجی کو خوب پہچانتی ہوں۔

رنگین جہانگیرپوری (تصویر سے باہر ڈائرکٹر سے) جناب غضب ہوگیا۔ گورد چیلی کا ناروہ ل رہا ہے، ایک محبّت کو موہوت کہہ رہا ہے۔ تو دوسری بازی کو باجی بتا رہی ہے خدا کے لئے تصحیح کرائیے میری محنت کا ستیاناس ہوا جاتا ہے۔

ڈائرکٹر (رنگین سے) خاموش ٹرٹر نہ کر۔ یہ کوئی بڑا فرق نہیں۔ ہر شخص ان الفاظ کو سمجھ سکتا ہے۔

(رنگین خاموش ہو جاتا ہے اور پارٹ جاری رہتا ہے۔)

فرخ پیاری شمسہ آہ کہ تم۔

ساؤنڈ ریکارڈر (سیٹی بجا کر) شی شی کیا کر رہے ہو۔

شمسہ کہو شے شے مشین میں ٹھیک نہیں آتا۔

رنگین (ساؤنڈ ریکارڈر کے پاس جا کر) لیکن صاحب لفظ شمسہ ہے۔ شمسہ کہو تے شے مشین میں ٹھیک نہیں آتا۔

ساؤنڈ ریکارڈر بکواس بند کرو جی۔ ہماری مشین میں شا شا کی بھدّی آواز درست نہیں آتی۔

(رنگین خاموش ہو جاتا ہے اور پارٹ جاری رہتا ہے۔)

فرخ پیاری شمسہ میں تمہیں کوئی دھوکا دینا نہیں چاہتا اور صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ میں گلرخ کو ـــــ زندہ نہیں دیکھ سکتا۔

شمسہ ..... (خاموش رہتی ہے۔)

فرخ۔ اس ناہنجار کو روئے زمین پر رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کو ضرور ہی مرنا ہوگا۔

شمسہ۔ اس بچارے کا کیا قصور۔

فرخ یہی کہ تم اس کو چاہتی ہو اور وہ میرے راستے میں ایک خطرناک کانٹا ہے میں اپنا راستہ صاف کر کے رہونگا۔

شمسہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے۔ میں تمہیں اس جرم سے باز رکھنے کی کوشش کروں گی۔

فرخ ایسا نہ کرو۔ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر تم نے مجامعت نہ کی، تو ضرور اپنا دل ٹھنڈا کر کے رہوں گا۔

نگین (ڈائرکٹر سے بآواز بلند) ہے ہے تم۔ غضب! یہ مجامعت کیا بلا ہے

ڈائرکٹر (فرخ سے) ٹھیرو ٹھیرو۔ یہ کیا کہہ گئے مجامعت کیا چیز ہے۔

فرخ اور کیا کہوں۔؟

نگین اجی جناب میری محنت پر کیوں پانی پھیر رہے ہو۔ لفظ مزاحمت ہے۔

فرخ کہہ تو رہوں مجامعت اور کیسے کہوں۔

نگین اجی حضرت، مزا . . . . . حمت!

فرخ مجا . . . . . . معت۔

نگین (سر پیٹ کر) جناب ڈائرکٹر صاحب آپ کیوں اس لفظ کی تصحیح نہیں کراتے ان کی زبان کو کیا ہو گیا ہے۔

فرخ میری زبان کو کیا ہو گیا ہے۔ آؤ ذرا تمہیں بتاؤ۔

اندر (فرخ) بڑھ کر میاں نگین کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ رسید کرتے ہیں کہ شاعر صاحب چکرا کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ شور مچ جاتا ہے اور سیٹھ رتنم کیکا ڈس جی مالک کمپنی تشریف لے آتے ہیں۔ نگین صاحب کے منھ میں پانی ڈال کر انہیں ہوش میں لایا جاتا ہے اور سیٹھ جی حقیقت حال دریافت کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب، اسٹار صاحب اور مکالمہ نویس صاحب اپنا اپنا بیان دیتے ہیں۔

سیٹھ جی رنگین سے، لیکن دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے۔

رنگین سیٹھ جی زمین و آسمان کا فرق پہلے تو دونوں الفاظ کی صوتیت میں فرق ہے۔ کہاں "مزاحمت" اور کہاں "مجامعت"، پھر معنوی لحاظ سے دونوں میں دور کا تعلق بھی نہیں۔

سیٹھ جی پہلے لفظ کے کیا معنی ہیں جو آپ نے اصل مسودے میں لکھا ہے۔

رنگین مزاحمت اس کے معنی ہیں رکاوٹ پیدا کرنا، کسی شخص کو کسی ارادے سے روکنا۔

سیٹھ جی اور اندر جی کیا کہتے ہیں۔

رنگین مجامعت۔

سیٹھ جی اس کا کیا مطلب۔؟

رنگین مرد و زن کا اختلاط جنسی۔

سیٹھ جی بھئی ہمیں آسان لفظوں میں سمجھاؤ۔

رنگین مگر آپ تو فارسی زبان جانتے ہیں۔ اس لئے میں نے ایسے الفاظ استعمال کئے۔!

سیٹھ جی فارسی ہمیں اس قدر نہیں آتی آپ سیدھے سادھے طور پر ہمیں سمجھائیے۔

رنگین جناب مجامعت مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو کہتے ہیں۔

سیٹھ جی جسمانی ملاپ۔

سیٹھ جی کا رنگ غصے کے مارے دفعتہً سرخ ہو جاتا ہے۔ اور گرج کر بول

اٹھتے ہیں۔

سیٹھ جی ایسا برا لفظ۔ ایسا فحش کلمہ پاجی خبیث تمہیں ایسا لفظ کہتے شرم نہ آئی۔

رنگین میں نے تو یہ لفظ نہیں لکھا میرا لفظ تو مزاحمت ہے۔

سیٹھ جی لیکن ایسا لفظ لکھا ہی کیوں۔ جو بولتے وقت ایسا فحش بن جائے کیا تمہارا ارادہ ہے کہ ہمارا فلم فعل ہو جائے۔؟ کیا تم اخبار نویسوں کو نہیں جانتے جو بال کی کھال اتارتے ہیں۔؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایسے لفظ پر ملک بھر کے اخبارات شور مچا دینگے اور لکھیں گے کہ "سونا سنسار" ایک فحش فلم ہے۔ نالائق۔ بے حیا۔ بے شرم ہمارے کسی دشمن کے بھیجے ہوئے آئے ہو ہم سے کوئی بدلا لینا تھا۔

(سیٹھ صاحب ڈائرکٹر کی طرف مخاطب ہوتے ہیں۔

سیٹھ جی سکا نیتا جی اس الّو کے پٹھے کو فوراً نکال دیجئے۔

ڈائرکٹر بہت اچھا جناب۔

سیٹھ جی فوراً ابھی وقت ایک دم۔

(سیٹھ جی آگے بڑھ کر رنگین صاحب کی پیٹھ پر بوٹ کی ایک ٹھوکر رسید کرتے ہیں۔

رنگین صاحب کی ٹوپی زمین پر گر پڑتی ہے۔

رنگین ٹوپی اٹھاتے ہوئے۔

سیٹھ جی دور ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے بقایا کل آ کر بابو جی سے لے لینا سیدھا گو یہاں سے نکلو۔

سیٹھ صاحب بڑھ کر رنگین صاحب کو ایک دھکا دیتے ہیں۔ رنگین صاحب

سیٹھ جی کے چہرے پر ایک حسرت نگاہ ڈال کر غایب ہو جاتے ہیں
پردہ گرتا ہے

فلم کی گواہی

جلیل اپنے کمرہ میں ایک کرسی پر بیٹھا گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک چٹھی دھری تھی جسے اس نے تیسری بار پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

عزیزم جلیل اگرچہ آپ نے کمپنی کا پانچہزار روپیہ ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاکر ایک بڑا جرم کیا ہے اور قانون میں اس فعل کے لیئے سخت سزا مقرر ہے۔ لیکن سردست یہ معاملہ صرف میرے اور آپ کے درمیان ہے۔ اس لیئے دو دن کے اندر اندر اس رقم کی واپسی کا بندوبست کیجیئے۔ ورنہ کمپنی کی آیندہ میٹنگ میں جس میں صرف چار دن باقی ہیں میں اس غبن کو ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو جاؤنگا اور اس صورت میں آپ کا انجام بلاشبہ افسوسناک ہوگا۔

آپ کا مرزا شمس الحق

مینجنگ ڈائرکٹر۔ ہلال مووی ٹون لاہور

جلیل ہلال مودی ٹون کا اکونٹنٹ تھا اور ہر روز اپنے دفتری فرائض ادا کر چکنے کے بعد شام کی ٹرین سے امرت سر چلا یا کرتا تھا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ وہ امرت سر کے لوگ جو لاہور کے دفاتر میں ملازم ہیں روزانہ لاہور جاتے اور شام کو واپس امرت سر آجاتے۔ لیکن جلیل کے اس معمول کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ جلیل امرت سر کی حسین وطرحدار رقاصہ کے قدم محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کی سابقہ زندگی بہت سادہ بے داغ اور معتبر تھی اور اسی سبب سے اسے ہلال مودی ٹون میں بغیر نقد ضمانت جمع کرائے اکونٹنٹ کی آسامی مل گئی تھی۔ لیکن محبت بری بلا ہے اور پھر ایک بیشہ ور رقاصہ کی محبت سے تو خدا ہی بچائے۔ جلیل نے آہستہ آہستہ کمپنی کا روپیہ اپنی محبوبہ کے عشوہ وناز کی نذر کرنا شروع کر دیا اور مینیجنگ ڈائرکٹر کو اس غبن کا اس وقت پتہ چلا جب کہ جلیل پانچ ہزار روپیہ پر ہاتھ صاف کر چکا تھا۔ مرزا شمس الحق جلیل کے والد مرحوم کے دوست تھے اور انہی کی سفارش سے جلیل کو ملازمت ملی تھی۔ اس لئے مرزا نے سردست اس غبن کو صیغہ راز میں رکھنا مناسب سمجھا اور مذکورہ بالا چٹھی کے ذریعہ جلیل کو تنبیہ کر دی۔

دنیا میں جلیل کا کوئی ایسا دوست موجود نہ تھا جو اس آڑے وقت اس کے کام آتا۔ اس کا ایک ہی مکان تھا جسے فروخت کر دینے کے بعد اسے عیال و اطفال سمیت کہیں سر چھپانے کی صورت پیدا نہ ہو سکتی تھی دنیا جلیل کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اور جیل کی سلاخوں نے اس کے دل ودماغ پر موت کی سی ہیبت طاری کر دی۔

پانچ ہزار روپیہ پیدا کرنا ناممکن تھا البتہ یاس و ناامیدی

کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جلیل کو امید کی صرف ایک ہلکی سی کرن نظر آتی تھی۔

اس نے یہ غبن اس صفائی سے کیا تھا کہ دفتر کے کاغذات میں اس کا ثبوت ملنا مشکل تھا۔ لیکن مرزا شمس الحق کو اس کا علم ہو چکا تھا۔ مرزا جہاں اس راز کو طشت از بام کر کے اسے مصیبت میں پھنسا سکتا تھا وہاں خاموش رہ کر اس کے جرم پر پردہ بھی ڈال سکتا تھا۔ لیکن کیا مرزا کو خاموش رکھنا ممکن ہے۔

جلیل نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنے ماتھے کو سہارا دیا۔ اور آنکھیں بند کر کے پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔

آدھ گھنٹہ کی غور و فکر کے بعد جلیل نے فیصلہ کر لیا۔ وہ چٹھی کو فیکر کے جیب میں ڈالتا ہوا اٹھا۔ اس کے چہرے پر شیخ نصرت کی روشنی جھلک اٹھی اس نے کھونٹی سے اپنی ٹوپی اتار کر سر پر رکھی۔ اور کوٹ پہنا پانچ منٹ کے لیے زنانہ میں گیا اور واپس آ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر نے کے بعد گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

دس منٹ میں وہ کراؤن سینما کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ تین بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لیے کراؤن سینما میں "آوارہ شہزادہ" فلم کا دن کا شو ۳ بجے سے ۵ بجے تک دکھایا جانے والا تھا۔ سینما کے بکنگ آفس پر تماشائیوں کا معمول سے زیادہ ہجوم تھا۔ جلیل نے ایک قلی کو آواز دی۔ اور اسے انعام دے کر فرسٹ کلاس کا ایک ٹکٹ منگوایا۔ وہ خود ٹکٹ فروش کو اپنا چہرہ دکھانا نہ چاہتا تھا۔ ٹکٹ جیب میں ڈالکر وہ ٹہلتا ہوا سینما سے کچھ دور آگے نکل گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی دوست اسے دیکھ لے وہ اس بات کا منتظر تھا کہ سب تماشائی سینما کے اندر داخل

ہو جائیں اور فلم شروع ہو جائے تو وہ سینما ہال کے اندھیرے میں داخل ہو۔ اس نے آخری گھنٹی کی آواز سنی تو خراماں خراماں اپنے درجے کی طرف بڑھا اور چپکے سے اندھیرے ہال میں داخل ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے فلم کو نہایت غور سے دیکھا۔ اور اس کا پلاٹ ذہن نشین کر لیا۔ فلم کے ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ اندھیرے اندھیرے میں باہر نکل کر ریلوے پل کی طرف روانہ ہوا۔ اور بیس منٹ کے بعد وہ ایک لاری پر سوار تھا جو بسرعت تمام لاہور کی طرف جا رہی تھی۔

لاہور پہنچ کر جلیل پیدل مرزا شمس الحق کی کوٹھی پر پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ مرزا کے عیال و اطفال ایک ہفتہ کے لئے لائل پور گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ بے تکلف اندر داخل ہو گیا۔ مرزا صاحب کے سامنے میز پر ہلال ہوزری ٹوں کے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بورڈ کے آئندہ اجلاس کے سلسلہ میں ان کی دیکھ بھال کر کے رپورٹ مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے کرسی سے اٹھ کر جلیل سے مصافحہ کیا۔ اور ایک آرام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جلیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پانی کی فرمائش کی۔ اس فرمائش کا باعث تشنگی نہ تھی بلکہ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نوکر اس کمرہ سے کتنی دور ہیں۔ لیکن نوکر کو آواز دینے کی بجائے مرزا خود پانی لانے کے لئے اٹھے اور معذرت کرتے ہوئے بولے کہ نوکر کوئی موجود نہیں۔ احمد بال بچوں کے ہمراہ لائل پور گیا ہوا ہے اور نبو کم بخت کے رشتہ داروں میں شادی کی تقریب تھی۔ اس لئے گیا وہ بیچے تک چھٹی لے کر گیا ہے۔ آپ کے آنے سے دس

ہی منٹ کے پہلے گیا ہوگا۔

یہ الفاظ سنکر جلیل کے دلمیں تسکین کی ایک لہر دوڑ گئی مرزا صاحب پانی لائے اور جب جلیل اسے پی چکا۔ تو مرزا صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کہئے اس وقت کیسے آنا ہوا۔ ؟

جلیل آرام کرسی پر سے اٹھا۔ اور اس نے جیب سے چٹھی نکالتے ہوئے کہا۔" میں آپ کی اس چٹھی کے متعلق حاضر ہوا ہوں۔ اس نے چٹھی کھول کر میز پر دھردی اور اس کے ایک کونے پر ہاتھ رکھے ہوئے ایک طویل آہ بھری۔

"کیا آپ میرے والد کا حق دوستی ادا کریں گے۔ ؟"

" میں یہ حق ادا کر چکا ہوں کہ آپ کو بغیر نقد ضمانت کے ملازمت دلا دی اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

کیا آپ مجھے پانچہزار روپیہ قرض دے کر ممنون احسان فرما سکتے ہیں۔ ؟ ادائیگی کی صورت یہ ہو گی کہ آپ میری تنخواہ سے ماہوار اقساط وضع کر لیا کریں۔ ؟

" ہرگز نہیں یہ چٹھی میرا آخری نوٹس ہے اور چار دن کے بعد مجھے لازمی طور پر آپ کی بددیانتی کا راز افشا کرنا ہوگا۔"

" میں بے بس ہوں مجھ پر رحم فرمائیے۔"

یہ درخواست بے معنی ہے۔ میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی صورت کوتاہی نہیں کر سکتا۔

"لیکن آپ نے چٹھی کی طرف اشارہ کر کے، یہ الفاظ کیوں لکھے۔؟"

"کون سے۔۔؟"

جلیل نے بظاہر چٹھی کے الفاظ دکھانے کے لیے اسے میز پر سے اٹھایا اور ارادۃً ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ چٹھی زمین پر گر گئی مرزا صاحب اسے زمین پر سے اٹھانے کے لیے جھکے ہی تھے کہ جلیل نے بجلی کی سرعت سے کام لیتے ہوئے اوور کوٹ کی جیب سے ایک ہتھوڑا نکالا۔ اور قبل اس کے کہ مرزا صاحب سر اٹھائیں جلیل نے پوری قوت کے ساتھ ہتھوڑے کی ایک ضرب ان کے ننگے سر پر لگائی مرزا صاحب ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور ان کے سر سے جوئے خون رواں ہو گئی جلیل نے دوڑ کر ہال کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور اپنا اوور کوٹ، کوٹ اور قمیص اتار کر نہایت احتیاط سے مرزا صاحب کا گلا دونوں ہاتھوں سے اس قدر دبایا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے بعد غسل خانہ میں جا کر اس نے اپنے ہاتھ جو خون سے لت پت ہو گئے تھے اچھی طرح سے صابن کے ساتھ صاف کیے اور نلکہ کھلا چھوڑ دیا۔

اس نے اپنے کپڑے پہنے اور میز پر سے ٹائم پیس اٹھا کر اس کی سوئیاں ساڑھے دس بجے پر رکھ دیں۔ پھر اس کی حرکت بند کر کے اور شیشہ توڑ کر اسے زمین پر الٹا رکھ دیا۔

مرزا خاموش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اور پانچ ہزار روپے کا راز مرزا شمس الحق کے ساتھ قبر میں دفن ہو جائے گا۔ ان خیالات کے ساتھ جلیل ہال کے دروازے کی طرف بڑھا ۔ دفعتہً اسے ہر کھٹ کی سنائی

چہرے دکھائی دیئے۔ اور ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ قاتل قاتل۔ لینا پکڑنا
جانے نہ پائے۔

جلیل نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور تیز قدمی کے ساتھ سیڑھی پھاٹک کی طرف چلنا شروع کیا۔ اس کے عقب میں کئی آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ لیکن اس نے پھاٹک کے قریب جا کر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جرأت کی تو معلوم ہوا کہ انسانی چہرے آوازیں اور پاؤں کی آہٹ سب کچھ اس کے واہمہ کی شعبدہ کاریاں تھیں۔

پونے نو بجے جلیل شیراز ہوٹل امرت سر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور ہوٹل کے متواضع، خوش طبع اور خوش گلو پروپرائیٹر مسٹر عزیز اس کے پاس بیٹھے ہوئے مالکوس کا ایک "خیال" گنگنا رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد جلیل اٹھا تو عزیز صاحب نے پوچھا۔ "کیوں اتنی جلدی چل دیئے۔"

جلیل نے جواب دیا کہ آوارہ شہزادہ فلم دیکھنے کراؤن سینما جا رہا ہوں۔ ہوٹل سے اٹھ کر جلیل کراؤن سینما پہنچا۔ اور ٹکٹ گھر جا کر اس نے نہ صرف ٹکٹ اپنے ہاتھ سے خریدا بلکہ بکنگ کلرک سے ایک روپیہ کے کھرا کھوٹا ہونے پر اس قدر جھگڑا کیا کہ سینما ہال کے ایک دو اور ملازم بھی آ گئے جنہوں نے جلیل کا غصہ فرو کیا۔ اور بکنگ کلرک کو مجبور کیا کہ وہ جلیل صاحب سے معافی مانگے یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ نو بجے کے قریب جلیل کے سینما آنے کا ثبوت مل سکے اس کے بعد ہال کے اندر جا کر بھی جلیل نے ایک میوہ فروش کے ساتھ ایسی مزاحیہ گفتگو کی کہ وہ جلیل کے سینما ہال میں آنے کی شہادت دے سکے ایک آخری بات اس نے یہ کی کہ سگریٹ فروش چھوکرے کو باہر سے سیگار لانے کے لئے کہا اور اس کے بدلے

ین دو آسنے انعام دینے کا وعدہ کیا۔

فلم شروع ہوا اور جلیل نے فلم دیکھنے کی بجائے شام کے واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ ابھی فلم کا پہلا مختصر سا نظارہ ہی ختم ہوا تھا کہ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر گھر کی راہ لی۔ اور مکان میں جا کر اطمینان کے ساتھ سو گیا۔

صبح چائے پینے کے بعد وہ بیٹھک میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک سب انسپکٹر پولیس اور ایک ہیڈ کانسٹبل کمرہ میں داخل ہوئے جلیل نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ اور انہیں کرسیوں پر بٹھا کر پوچھا۔

"ارشاد۔ ؟"

سب انسپکٹر ہم مسٹر جلیل سے ملنا چاہتے ہیں۔

جلیل میرا نام — جلیل ہے۔

سب انسپکٹر۔ لاہور میں کل رات مرزا شمس الحق مینجنگ ڈائرکٹر ہال مودی ٹون قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کیا آپ قاتل کی تلاش میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ؟

جلیل۔ مرزا شمس الحق ہمارے مینجنگ ڈائرکٹر۔ ؟

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہاں قتل کئے گئے۔ ؟

سب انسپکٹر اپنے مکان میں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ؟

جلیل۔ ہیں۔ ؟ میں کس طرح آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے اس قتل سے کیا تعلق۔ ؟

سب انسپکٹر نے ایک چٹھی جیب سے نکال کر جلیل کو دکھائی اور کہا۔

"یہ تعلق۔" یہ وہی چٹھی تھی جو مرزا شمس الحق نے جلیل کو لکھی تھی اور جسے جلیل گھبراہٹ میں نعش کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ جلیل نے چٹھی کو پڑھا اور کہا کہ یہ چٹھی مرزا صاحب نے میرے نام ارسال کرنے کے لیے لکھی ہوگی۔ اور اس سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ میں نے کمپنی کا پانچ ہزار روپیہ غبن کیا ہے۔ لیکن اس سے مرزا صاحب کے قتل پر تو کچھ روشنی نہیں پڑتی۔؟

سب انسپکٹر:۔ ہماری نظروں سے دیکھئے۔ پولیس کی نظروں سے دیکھئے اگرچہ ہمیں چٹھی کا لفافہ نہیں مل سکا۔ تاہم ہمارے قیافہ کے مطابق یہ چٹھی آپ کو ملی اور یہ بہت حد تک قتل کی محرک ہو سکتی ہے۔

جلیل۔ تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں قاتل ہوں۔؟

سب انسپکٹر۔ ممکن ہے کہ مفصل تحقیقات اس کے خلاف ثابت کر سکے لیکن سردست۔ . . . . . ."

جلیل (بات کاٹ کر) لیکن قتل کس وقت کیا گیا۔؟

سب انسپکٹر مقتول کے کمرہ میں ٹوٹا ہوا ٹائم پیس پایا گیا جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ قاتل و مقتول کی باہمی جد و جہد کے دوران میں میز پر گر کر ٹوٹ گیا ہوگا اس کی سوئیاں بتاتی ہیں۔ کہ واردات کا وقت ساڑھے دس بجے کا تھا۔ بہر حال یہ واقعہ گیارہ بجے سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ گیارہ بجے جب مقتول کا نوکر باہر سے کوٹھی پر پہنچا تو اس نے فوراً پولیس کو ٹیلیفون کیا۔

جلیل نے ایک پر زور قہقہہ لگایا اور کہا جناب من۔ میں تو کل رات نو بجے سے بارہ بجے تک کراؤن سینما میں فلم "آوارہ شہزادہ" دیکھ رہا تھا۔

سب انسپکٹر۔ اس کا ثبوت۔؟

جلیل ۔ ایک کیا بیسیوں ثبوت۔

یہ کہہ کر جلیل نے شیراز ہوٹل کے پروپرائیٹر کا نام سینما ہال کا بکنگ کلرک وہاں کا میوہ فروش اور سگریٹ فروش بطور شہادت گن دیئے اور ان سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ سنائی۔ سب انسپکٹر نے ایک منٹ تامل کیا۔ اور پھر ہیڈ کانسٹبل کو ہدایات دیکر ہوٹل اور سینما جانے کے لئے حکم دیا۔

ہیڈ کانسٹبل کے جانے کے بعد جلیل نے فلم مذکورہ کی تعریف و توصیف کے بعد اس کا پلاٹ سنانا شروع کر دیا۔ اور مختلف گانوں اور دلچسپ نظاروں کو توضیح کی صاحب کمال تو یہ ہے کہ ماسٹر مودک فقیر چھوکرے کا پارٹ بھی ادا کرتا ہے اور شہزادہ کا بھی۔ اور دونوں ایک ہی نظارہ میں باہم گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

سب انسپکٹر۔ کیمرے کی شعبدہ بازی ہے۔

جلیل اور آخری سین تو بہت ہی شاندار ہے۔ شاہی دربار امرائے دربار کی شان و شوکت۔ ایوان شاہی عظمت۔ جلوس۔ ہاتھی۔ خدام ......

ہیڈ کانسٹبل واپس آگیا۔ اور اس نے سب انسپکٹر کو باہر بلا کر پانچ منٹ تک گفتگو کی۔ اس کے بعد دونوں کمرہ میں داخل ہوئے اور سب انسپکٹر نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

مسٹر جلیل۔ فلم کا پلاٹ عمدہ ہے اور آپ کا پلاٹ بھی قابل تعریف ہے لیکن افسوس کہ اس میں ایک بہت بڑی خامی رہ گئی جن گواہوں کے آپ نے نام گنوائے وہ تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ۹ بجے سینما ہال میں تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ

جس وقت آپ دربار شاہی جلوس اور ہاتھیوں کا آخری سین دیکھ رہے تھے اس وقت سینما ہال میں ایک متنفس بھی موجود نہ تھا۔

جلیل۔ وہ کیسے۔؟

سب انسپکٹر۔ سینما کے منیجر کا بیان ہے کہ فلم صرف دس منٹ چلا تھا کہ مشین بگڑ گئی اور ایسی بری طرح سے ٹوٹ گئی کہ تماشائیوں کو ان کے دام واپس کر کے رخصت کرنا پڑا۔ جلیل کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور سب انسپکٹر نے جیب سے ہتھکڑی نکال کر کہا۔

دونوں ہاتھ باہر نکالئے جناب۔

گستاخی معاف!

پرمی استھان

کرشن ہوا کے تند جھونکے کی طرح کمرہ میں داخل ہوا اور ایک آرام کرسی پر مُردہ انسان کی طرح گر گیا۔ موہن نے جو ایک کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا سر اٹھایا اور کہا خیر تو ہے کرشن۔؟

کرشن نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک لمحہ کے بعد اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکل سکا۔ "پانی۔"

موہن نے اٹھ کر لیمونیڈ کی ایک بوتل کھولی اور گلاس میں ڈال کر گلاس ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ جو کہ کرشن کے دائیں طرف پڑی تھی۔ کرشن نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن موہن نے کہا۔ ذرا ٹھہرو ابھی مت پیو۔

کرشن ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے جیب سے رومال نکالا۔ اور اسے اپنی سانس سے گرم کر کے ماتھے پر رکھا۔ ایک منٹ کے بعد جب اس نے رومال ہٹایا تو موہن نے دیکھا کہ ایک انچ کے برابر جگہ سرخ ہو کر ابھر آئی تھی۔

پانچ منٹ کے توقف کے بعد کرشن نے گلاس اٹھا کر ایک ہی نفس میں پی لیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ موہن نے اپنی کرسی کھینچ کر نزدیک کر لی اور گھبرا کر پوچھا آخر کہو تو کیا معاملہ ہے۔؟

کرشن بچپن میں کہانیاں سنتے تھے۔ لیکن آج میں نے انہیں دیکھ لیا۔

موہن۔ اگر تمہارے دماغ کی یہی حالت رہی تو ہر روز دیکھا کرو گے۔ لیکن بتاؤ تو سہی کیا دیکھ لیا۔ سانپ۔ گیدڑ۔ بھیڑیے۔؟

کرشن نے پھر رومال کو ایک پر زور پھونک سے گرم کر کے ماتھے پر رکھا اور کہا۔

"میں دوڑتا آ رہا تھا کہ اندھیرے میں ایک درخت سے ٹکر ہو گئی۔ آپ ضرور ہنسیں گے اور جب میں نے واقعہ سنایا تو آپ مذاق اڑائیں گے۔ لیکن جب میں ان کی طرف دیکھ رہا تو۔۔۔۔۔۔"

موہن کی تیز نگاہوں کے طلسم نے اسے خاموش کر دیا اور ایک لمحہ کے بعد وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

موہن اور کرشن بچپن کے دوست تھے اور دوران جنگ میں سمندر

پار دو سال تک اکٹھے رہے تھے اب کئی سال کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔

کرشن بیکار تھا اور اس کی صحت بہت خراب تھی۔ اخلاقی اور جسمانی کمزوریوں نے اس کا ستیاناس کر دیا تھا۔ دنیا اس کے ساتھ نامہربانی سے پیش آئی تھی۔ اور اس نے خود اپنے خلاف دنیا سے سازش کر رکھی تھی۔ پرانی محبت اور سالہا سال کے تعلقات نے ہوش ہارا اور موہن نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ تاکہ اس کی جسمانی و اخلاقی اصلاح کرے۔

اس نے لاہور کی شورشوں سے دور رہ کر ایک نئی کتاب لکھنے کے لئے شاہدرہ میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور کرشن اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کرشن کی اخلاقی اصلاح ایک حد تک ہو چکی تھی۔ اور جسمانی اصلاح کے لئے موہن اسے دن میں چھ میل کی سیر کے لئے بھیجتا تھا۔ اب رات کے دس بج چکے تھے اور کرشن چھ میل ختم کر کے آ رہا تھا۔

کرشن نے سگریٹ کا طویل کش لگا کر سلسلہ کلام شروع کیا۔

میں نے آج پریاں دیکھی ہیں۔ اپنی ان آنکھوں سے پریاں دیکھی ہیں۔ میں نے جن و پری کا قائل نہ تھا۔ لیکن آج میں نے انہیں دیکھ لیا۔

موہن تم بڑے خوش قسمت ہو۔ ورنہ تمہاری قسم کے لوگوں کے دیکھنے کے لئے تو چوہوں اور مکڑیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

کرشن میں مذاق تو نہیں کرتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے انہیں دیکھا وہ تعداد میں چھ یا آٹھ تھیں۔ چاند کی روشنی میں رقص کر رہی تھیں۔ نہایت دلکش ساز بج رہے تھے۔ لیکن معلوم نہیں کہاں ان کے سحر

آفریں نغمہ کی صدا کہیں درختوں کے اندر سے نکل رہی تھی۔ اور پریاں اس موسیقی کی آواز کے ساتھ ناچتی تھیں۔

موہن۔ لیکن یہ نظارہ تم نے کہاں دیکھا۔؟

کرشن نے انگلی سے کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کے چوکھٹے میں گھنے جنگل کی دھندلی تصویر چھٹکی ہوئی چاندنی میں کسی آرٹسٹ کے قلم کی بہترین صنعت کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔

وہاں۔ ذخیرے کے عین وسط میں ذخیرے کے کنارے کنارے حسب معمول آ رہا تھا۔ لیکن چھوٹے پل پر جب پہنچا تو میرے بائیں ہاتھ ذخیرے کے اندر سے شیریں موسیقی کی آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ میں ٹھہر گیا۔ اور کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ میں حیران تھا کہ اتنی رات گئے اس سنسان جنگل میں موسیقی کے ترانے کیا معنی؟ موسیقی بند ہو گئی۔ لیکن ایک دو منٹ کے بعد پھر شروع ہو گئی۔ میں نے جنگل کے اندر قدم رکھا۔ وہاں بہت اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں چاند کی روشنی نورانی پریوں کے نقوش پا کی طرح نظر آتی تھی۔ موسیقی کی صدا میری رہنمائی کی۔ یہ آواز کبھی کبھی بند بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن زیادہ عرصہ تک نہیں رکتی تھی۔ میں آواز کے بہت نزدیک پہنچ گیا۔ اور دفعتہً مجھے ایک کھلی جگہ نظر آئی اور میں نے ایسا نظارہ دیکھا کہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موسیقی کی آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ سازندے درختوں کے اوپر یا ان کے پیچھے کہیں اندھیرے میں چھپے ہوئے ہوں گے البتہ کھلے میدان میں چاند کی روشنی میں سات آٹھ پریاں رقص کر رہی تھیں۔ یہ رقص عام رقص نہ

تھا اور یہ لڑکیاں نام لڑکیاں نہ تھیں ان کے پاؤں ننگے تھے اور سفید باریک لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رقص کے دوران میں ان کے پاؤں زمین کو چھوتے ہی نہیں۔ میں نے ایسی تصویریں بعض پان کی دوکانوں پر ٹنگی ہوئی دیکھی ہیں یا عجائب خانہ کے اندر بعض پرانے برتنوں پر ان کا ناچ کچھ اس قسم کا تھا۔

کرشن نے کرسی سے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ اور موہن نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ بیٹھ جاؤ بھائی۔ تم نے شاید رقص دیکھا ہی نہیں۔ یا تم نقل اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ کرشن نے کرسی پر بیٹھ کر اور ایک سگریٹ سلگایا۔

میں عالم تحیر میں غرق ان کی طرف تک رہا تھا۔ یہ سب نظارہ غیر ارضی تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد شاید انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہوگا کہ ناچتی ہوئی ایک قطار میں میری طرف بڑھیں اور جب میرے قریب آگئیں تو میرے منھ سے چیخ نکل گئی اور میں اس زور سے بھاگا کہ دو روز تک ورزش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

موہن تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تم نے اپنی آنکھوں سے پریوں کا ناچ دیکھ لیا۔ شاید ہزار سال سے کسی انسان نے یہ نظارہ نہ دیکھا ہوگا۔ کرشن ذرا تصور فرمایئے کہ اگر وہ مجھے پکڑ لیتیں تو کیا ہوتا۔؟

موہن۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ کیا ہوتا۔ اغلب یہ ہے کہ تم ان میں سے کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے اور تمہیں انسان سے کسی پودے کی شکل میں تبدیل کر دیا جاتا۔ شکر کرو کہ تم اپنی اصلی صورت میں گھر آگئے۔ ورنہ اب تک کوئی بلبل تمہاری شاخوں پر بیٹھا نغمہ سرا نظر آتا۔ یا ممکن ہے تم آک یا تھوہر

بنا دیئے جاتے۔ کرشن نے ایک پر زور قہقہہ لگایا۔

موہن۔ اچھا دوست! کل رات ہم دونوں اس مقام پر چلیں گے۔

کرشن۔ میں؟ ہرگز نہیں۔ مطلق نہیں۔ اگرچہ میں انسانی قالب میں رہ کر انسان کے لئے چنداں مفید انسان نہیں۔ تاہم درخت پودے اینٹ پتھر بننا پسند نہیں کرتا۔ آپ تنہا جا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے معاف فرمایئے۔ میرا دل خوف سے بیٹھا جا رہا ہے۔

دوسری شب جونہی شام ہوئی اور چاند نکلا موہن گھر سے چل کھڑا ہوا۔ یہ ایک ایسی رات تھی جو پراچین بھارت قدیم شعرا ور فراموش شدہ تہذیب کی یاد تازہ کرتی تھی سست ہوا کے جھونکے درختوں کی چوٹیوں کو آہستہ آہستہ جھولا جھولا رہے تھے آسمان پر بادل نیم خوابیدہ حالت میں سہج سہج چل رہے تھے۔

چاند کی روشنی دن کی طرح تیز تھی۔ موہن کے دائیں ہاتھ درختوں کا گھنا ذخیرہ حد نگاہ تک نظر آ رہا تھا۔ اور اس کا اپنا سایہ بھوت کی طرح اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

موہن نے چاند کے صاف صاف چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ جادو اثر رات کا طلسم اس کی رگوں میں سرایت کرنے لگا جھلملاتے ہوئے تارے نیچے

کی طرف تک رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہر لاہور کی رونق انار کلی کی بھیڑ بھاڑ اور ٹھنڈی سڑک کی چہل پہل سے بالکل بے خبر شاہدرے کے ذخیرے یا صرف موہن کی طرف دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے سے چشمک زنی کر رہے ہیں۔

موہن چھوٹے پل کے پار جنگل میں گھس گیا۔ راوی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ موہن کے چلنے سے گھاس کی آواز اور شاخوں کی سرسراہٹ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس پریاں چھپی ہوئی ہیں۔ اور اس کی آمد پر ڈالیوں اور پتوں کے پردے میں سے لبوں پر انگلیاں رکھے ہوئے اسے جھانک رہی ہیں۔

موہن یکایک ٹھہر گیا اور اس نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ خاموشی ہر طرف خاموشی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درخت بھی ساکن اور خاموش ہو کر موہن کے ساتھ سننے میں شریک ہو گئے ہیں۔

دفعتہً موہن نے کچھ سنا پہلے تو یہ اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی۔ اس کے بعد ایک مدھم شیریں دل آویز نغمہ بہت دور سے سنائی دینے لگا۔ موہن کا دل خوشی سے اچھل پڑا اور اس نے نغمے کی آواز پر قدم بڑھایا۔

پانچ منٹ تک جھاڑیوں اور شاخوں سے جد و جہد کرتا ہوا اس چھوٹے سے میدان کے کنارے پر پہنچ گیا۔ جہاں کرشن نے پریوں کے ناچ کا لطف اٹھایا تھا اور ایلو! موہن کی آنکھوں کے سامنے چاند کی پوری روشنی میں آٹھ دس پریاں سازوں کی دھن کے ساتھ رقص کر رہی ہیں!

موہن نے اپنے آپ کو ایک بڑے درخت کے پیچھے چھپا لیا۔ اور اس غیرارضی غیرانسانی رقص کا نظارہ کرنے لگا۔ سازوں کا نغمہ بہت دلکش تھا۔ لیکن سازندے نظر سے غائب تھے۔ لڑکیاں زمین کی لڑکیاں نہ تھیں۔ ان کے پاؤں ننگے تھے اور زمین سے چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے۔ ان کے بہت باریک سفید لباس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اور ہر ایک کے سر پہ پھولوں کا ایک تاج بہار دے رہا تھا۔

دفعتہً ایک طرف سے روشنی کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ ایسی تیز روشنی کہ دنیا میں اس کی نظر کبھی نہ دیکھی تھی۔ چاند کی روشنی ماند پڑ گئی اور میدان بجلی کی طرح چمک اٹھا۔ موہن نے ہر ایک پری کے نقش و نگار کو غور سے دیکھا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ ان میں پریوں کی ایک ملکہ ہے اور باقی اس کی سہیلیاں۔

موسیقی اور ناچ جاری تھے حتیٰ کہ راجہ اندر کی یہ داسیاں ناچتی ہوئی موہن کے قریب آ گئیں اور اب موہن نے ملکہ کی خوبصورتی کو غور سے دیکھا اور سب سے زیادہ دل فریب چیز جو اسے پسند آئی وہ ملکہ کے سُرخ اور چمکدار لب تھے گویا وہ ایک کمان تھی جو کیوپڈ (عشق کے دیوتا) کے ننھے ہاتھوں کے لئے تیار کی گئی تھی۔

دفعتہً نغمہ تھم گیا۔ رقص بند ہو گیا روشنی غائب ہو گئی اور موہن نے چاند کی روشنی میں پریوں کو کھیلتے ہوئے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے واپس جاتے دیکھا۔

پانچ منٹ کے بعد کسی نامعلوم جگہ سے پھر روح پرور نغمہ شروع ہوا۔

دنیائے جنات کی خیرہ کن روشنی پھر میدان پر چھاگئی۔ اور پریوں نے وسط میدان میں ایک حلقہ باندھ کر ناچنا شروع کیا۔ موہن دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ گاتی کیوں نہیں۔؟ بولتی کیوں نہیں۔؟ آخر ان کی زبان کیا ہے۔؟ پریاں کس زبان میں باتیں کرتی ہیں۔؟ کوہ قاف پر کون سی بولی ہے۔؟

موہن انہی خیالات میں محو تھا کہ دفعتاً میدان کے پرلے سرے سے ایک قوی ہیکل، مہیب صورت دیو کندھے پر گرز رکھے ہوئے شیر کی طرح دھاڑتا ہوا پریوں کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ منھ سے کف جاری تھی اور نہایت ہی غضب ناک لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"آدم بو۔ آدم بو۔" مجھے یہاں انسان کی بو آتی ہے۔ یہاں ضرور کوئی انسان ہے۔ ہماری محفل میں کوئی چور ہے۔" آدم بو۔ آدم بو۔"

پریوں کی ملکہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

میرے آقا میری روح۔ میری جان یہاں انسان کا گزر کس طرح ہو سکتا ہے۔؟ یہ آپ کا وہم ہے۔

دیو نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں کہا

"ہرگز نہیں۔ مجھے انسان کی بو آتی ہے۔ بنی آدم یہاں ضرور

موجود ہے۔ میں اس کو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

یہ کہہ کر دیو گرز گھماتا ہوا آگے بڑھا۔

موہن نے اپنے کانوں سُنا کہ ہندوستان کے دیو اور پریاں ہندوستانی بولتی ہیں لیکن اس امر کے جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اس خوفناک نظارہ کی طرف سے نہایت سرعت کے ساتھ پیٹھ موڑی اور اس کی پہلی جست اس قدر طویل تھی کہ اگر وہ انٹرنیشنل لانگ جمپ کے مقابلہ میں شامل ہو کر ایسی چھلانگ لگاتا تو دنیا بھر میں اوّل رہتا۔ پورے زور سے دوڑتے گرتے پڑتے ہانپتے کانپتے اس نے پہلا سانس ذخیرہ کے باہر نہر کے پُل پر آکر لیا۔

دوسری صبح کو جب بیدار ہوئے تو موہن اور کرشن دونوں کو بخار تھا۔

بخار سے موہن بیہوشی کے عالم میں بڑبڑاتا تھا۔

"مجھے بچاؤ۔ اس دیو سے مجھے بچاؤ میں مرگیا ..... مت مارو۔ مجھے نہ مارو ...... میں پھر کبھی تمہاری پریاں دیکھنے نہیں آؤں گا۔ ہائے مرگیا .... اوہ .... تم کون ہو۔ ---- ہے ہرگز نہیں دنیا کی کوئی عورت تم سے خوبصورت نہیں۔ تمہارے لب ..... اوہ ..... اس قدر سرخ اتنے خم دار کیوپڈ کی کمان ... . پکڑو ..... پکڑو!

موہن خاموش ہوتا تو کرشن بول اٹھتا۔

"نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نفرت ہے۔ نہ دیکھو میں گلاب کا پودا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو میرے پھول سے کیسی خوشبو آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تم سے کب محبت کی ہے ۔ ؟ نہیں نہیں مجھے درخت نہ بناؤ ۔ مجھے ہر روز بارہ میل چلنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاند کی روشنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر سازندے کہاں ہیں ۔ ؟ اوہ

بہاری (ملازم) دونوں کے سرہانے بیٹھا حیران بھی ہو رہا تھا اور پریشان بھی ۔

دن بھر اسی طرح گزر گیا ۔ شام کے وقت مریضوں کو کچھ ہوش آیا ۔ بہاری نے چاول پکائے نیچے دودھ چاول کھلائے ۔ رات کو بخار کا زور ہو گیا ۔ اور بہاری تمام رات تیمارداری میں مصروف رہا ۔

صبح ہوئی ۔ دونوں کو افاقہ ہوا ۔ لیکن ایک دن اور ایک رات کے بخار نے نڈھال کر دیا ۔

اتوار کا دن تھا ۔ ۸ بجے کے قریب ان کے دوست مظفر ہاشمی صاحب ملنے آئے ۔ خیر و عافیت پوچھی موہن نے " کچھ ایسے ہی طبیعت خراب تھی کہہ کر ٹال دیا ۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں ۔

مظفر صاحب کے ہاتھ میں اخبار "پارس" تھا ۔ موہن نے اسے پڑھنا شروع کیا ۔

تھوڑی دیر بعد اخبار کرشن کے سینہ پر دے مارا اور کہا ۔

"صفحہ ۸ پڑھو ۔"

لکھا تھا۔

"شبستان۔"

"از قلم باصر۔"

مہر مووی ٹون۔ یہ کمپنی حال ہی میں لاہور میں قائم ہوئی ہے۔ اور بہت اچھے پیمانے پر چل رہی ہے۔ اس کا پہلا فلم "پری استھان" ہمارے محترم دوست ابو العلا چشتی نے لکھا ہے۔ اور اس کے ابتدائی سین شنگر اور برہسپت کی نام کو شاہدرہ کے ذخیرہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ شوٹ کیے گئے ہیں۔"

کرشن اور موہن نے آنکھیں ملیں۔ دونوں اپنی حماقت پر مسکرائے لیکن مضطر ہاشمی کو اس خاموش گفتگو سے آگاہی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ انقلاب کے افکار و حوادث پڑھنے میں منہمک تھا۔

فلم ایکٹرس کی ڈاک

دراصل سب سے زیادہ ڈاک تو اس سرکاری افسر کی ہوتی ہے۔ جس نے کلرکی کی اسامی کے لئے اشتہار دے رکھا ہو۔ اور اس سے دوسرے درجے پر اس شخص کی ڈاک ہوتی ہے۔ جس نے امساک کی گولیاں بطور نمونہ مفت کا اعلان کر رکھا ہو۔ لیکن دلچسپ ترین ڈاک صرف دو شخصیتوں ہی کی ہوتی ہے۔ ایڈیٹر کی ڈاک اور فلم ایکٹرس کی ڈاک۔

جس قسم کے خطوط ایکٹرس کو روزانہ موصول ہوتے رہتے ہیں اس کے چند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ پڑھیئے اور لطف اٹھایئے۔

فلمی ایڈیٹر کا خط

محترمہ —!

تسلیم -!

"فلم کی بات" کا تازہ پرچہ ارسال خدمت ہے سرورق پر اپنی سہ رنگی تصویر ملاحظہ فرمایئے — اور یاد رہے کہ اس ہفتہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تصویر شایع کرنا ضروری تھا - کیونکہ رسالہ کے اندر اس کی وہ تقریر درج ہے جو اس نے فلموں کی حمایت میں کی - لیکن میری قربانی دیکھیئے کہ میں نے اس حقیقت کو جانتے ہوئے آپ کی تصویر شایع کی - کہ اگر میں غازی موصوف کی تصویر شایع کرتا تو ان کی فلمی تقریر کے علاوہ ماتڑیو کانفرنس کی مناسبت سے یہ پرچہ سیکڑوں کی تعداد میں فروخت ہو جاتا - لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی - اور آپ کی تصویر کی مناسبت سے اس تازہ فلم "تیر کی نوک" پر بھی بسیط تبصرہ کر دیا ہے۔

جس میں آپ نے ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے آپ اس مضمون کو غور سے پڑھیئے اور دیکھیئے کہ پارٹ کے اندر جہاں جہاں آپ نے لغزشیں کی ہیں - میں نے ان لغزشوں کو آپ کی بہترین خوبیاں ثابت کیا ہے دوست مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ تم نے تو مس . . . . . کو دنیا بھر کی ایکٹرسوں سے بڑھا دیا ہے - لیکن میں ان سے کہتا ہوں، کہ محترمہ فی الحقیقت دنیا بھر کی ایکٹرسوں کی سرتاج ہیں اور عنقریب ہالی وڈ والے آپکو بلانے والے ہیں۔

پچھلی دفعہ جب میں نے آپ کی ایکٹرسی پر ایک ہنگامہ خیز مضمون لکھا تھا اس وقت سے آپ کے دشمن میرے رسالے کے خلاف پروپگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ اور مجھے بہت نقصان ہو رہا ہے، آپ نے جو دس روپے کا منی آرڈر بھیجا تھا اس سے کاتب کا بل بھی نہ چکایا جا سکا۔ پانچ اور ہوتے تو کم از کم یہ بلا تو سر سے ٹل جاتی۔

بہر حال آپ میرا خیال رکھیں نہ رکھیں، مجھے تو آپ کی ترقی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ اور خواہ میرے رسالے کی اشاعت کتنی ہی کیوں نہ گھٹ جائے میں حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔

اور سچ پوچھو تو یہ آپ پر کوئی احسان بھی نہیں۔ کیونکہ آپ کے فنی اوصاف پر مضامین لکھنا فن کی خدمت کرنا ہے۔ اور حاضری حسن کی تعریف پر خامہ فرسائی کرنا مصوّرِ فطرت کے شاہکار کا اعتراف ——

ساٹھویں سالگرہ مبارک!

نیازمند ایڈیٹر

بیرسٹر کا خط

مس ...... صاحبہ

آداب عرض۔

اگر آپ اخبارات میں عدالتی کالموں کا مطالعہ کرتی ہیں تو ضروری بات ہے کہ آپ میرے نام سے واقف ہوں، کیونکہ میں نوجوان ہونے کے باوجود

نہ صرف اپنے شہر کا ایک کامیاب ترین قانون داں ہوں بلکہ ملک کے ہر حصّے میں بلایا جاتا ہوں۔

باعث تحریر آنکہ میں نے ایک مقامی رسالہ "داستان فلم" میں آپ کے خلاف ایک مضمون پڑھا ہے، جو تعزیرات فلم کی دفعہ ۱۹ کی زد میں آتا ہے۔ اور ایڈیٹر پر "ازالہ حیثیت فلمی" کا دعوےٰ دائر کیا جاسکتا ہے، رسالہ ایک بڑے سرمایہ دار کی ملکیت ہے اور اس سے بہت بڑی رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے اگر آپ میری مؤکل بننا چاہیں تو میری قانونی خدمات حاضر ہیں اور پانچ ہزار روپے کی ڈگری معہ خرچہ کے دلانے کا یقین دلاتا ہوں۔

باقی رہا میرے محنتانہ کا سوال، اس کے متعلق عرض ہے کہ مجھے اپنے نیازمندوں ہی میں شمار کیجیے اور اس وہم میں نہ پڑ جائیے کہ میں نقد معاوضہ کے لالچ میں آکر یہ تجویز پیش کر رہا ہوں۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے۔

البتّہ میرا مطلب یہ ہے کہ زرنقد کی بجائے محنتانہ کی اور صورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اور اصولاً مجھے اور آپ کو کسی نہ کسی صورت پر متفق ہو جانا چاہیئے۔ تشریح کی ضرورت نہیں، آپ ماشاء اللہ عقلمند ہیں۔ البتّہ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون کی رو سے کوئی مؤکل اپنے وکیل سے محنتانہ ادھار نہیں کرسکتا۔

لیعنی محنتانہ نقد ہو یا بصورت "جنس" ہر حالت میں پیشگی

لینا لازمی ہے۔ ورنہ وکیل پر حکومت مقدمہ چلا دیتی ہے۔ میں کنگال بنک کے مشہور مقدمہ غبن کے سلسلہ میں کلکتہ آ رہا ہوں۔ ارشاد ہو تو قدمبوسی کا فخر حاصل کر دوں۔

بندہ
بیرسٹر ایٹ لا عمر ۲۵ سال

کالجیٹ کا خط

ڈیرس ......!

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے
جنوری تو ہے نوا ے ماہ دسمبر ہوں میں

گھر بار چھوٹا، اپنے پرائے چھوٹے، کالج چھوٹا، سب سے بڑھ کر یہ کہ کرکٹ بھی گیا۔ اور اب دم بھی چھوٹا جا رہا ہے۔ میں اس رات پر ہزار ہزار لعنت بھیجتا ہوں، جبکہ سکرین پر آپ کو دیکھا تھا۔ پھر اس روز کو کوستا ہوں۔ جبکہ ایک کیلنڈر پر آپ کی رنگین پکچر دیکھی تھی۔ غالب نے ٹینی سن کی تتبع میں خوب کہا ہے۔

ہو گیا نوٹو گرافر کا تمہارے ہارٹ فیل
آدھی کھنچی تری تصویر آدھی رہ گئی

میری پر لیف داستان غم یہ ہے کہ آپ کی پکچر دیکھتے ہی میرے دل پر ایک تیر لگا۔ عرصہ تک ان فلموں کو دیکھنے جاتا رہا جن میں آپ نے

پارٹ گیا، اور مدتوں آپ کی رنگین تصویر سینے سے لگائے پھرا۔ آخر تاب جدائی نہ رہی تو گھر سے دو سو روپیہ چرایا، اور آپ کے ٹاؤن میں آ گیا۔

ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

ٹاؤن میں اپنے یہ لیلےٰ نے پوسٹر لگا دیئے
کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

جب سے یہاں آیا ہوں آپ کی کمپنی میں ملازم ہونے کی کوشش کر رہا ہوں ایکٹری تو کیا دربانی بھی نہیں ملتی۔ آپ کی کمپنی کا دفتر ریلوے کے دفتر سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہاں تو صرف اس وقت امیدواروں میں ہجوم ہوتا ہے۔ جب ڈیپارٹمنٹ والوں نے کسی پوسٹ کا اشتہار دے رکھا ہو۔ مگر سٹوڈیو کے باہر تو ہر روز مجھ جیسے بدنصیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ اور مجھے میر کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

میں ہر روز آپ کو موٹر کار میں سٹوڈیو آتے جاتے دیکھتا ہوں لیکن انٹرویو کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ کا مکان بھی جانتا ہوں لیکن مجال نہیں رکھتا کہ گیٹ کے اندر قدم رکھ سکوں اور آپ کا کتا؟ ڈائم اٹ روز و شب گیٹ پر پہرہ دیتا ہے۔ اور ہر اجنبی کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔

میں آپکو بے اعتنائی کا الزام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ آپ کو علم ہی نہیں کہ کوئی حرماں نصیب اپنے باپ کی لاکھوں روپے کی دولت پر لات

مارکر آپ کے دروازے پر پڑا ہے۔ یہ میرا پہلا مکتوب ہے۔ جسے نوٹس سمجھئے اگر آپ نے دو تین روز تک میری خبر نہ لی تو میری لاش پوسٹ مارٹم روم میں نظر آئے گی۔

پتہ .... آپ کا دلدادہ

نوٹ :- یاد رہے کہ میرے پاس صرف دو تین روپے باقی رہ گئے ہیں۔

زمیندار کا خط

جانِ من -!

بڑی احمق ہو، اور بہت بے وفا ہو۔ میں نے زمین کے دو مربعے بیچ کر اس کی تمام آمدنی تم پر نچھاور کر دی۔ لیکن تم نے یہ بیوفائی کی کہ ایک مزاحیہ اخبار میں میرا خاکہ اڑا دیا۔ مجھے تو اسی وقت تمہاری کج ادائی کا یقین ہو جانا چاہیئے تھا۔

جبکہ میں نے پہلا مربع بیچا تھا۔ اور دو روز تمہارے ہاں قیام کیا تھا۔

اور جب میرے چلے جانے کے بعد تم نے ٹیلی فون پر آغا حشر مرحوم سے کہا تھا کہ ایک دیہاتی الّو خوب پھنسا۔ جانتی ہو کہ مجھے یہ بات کس نے بتائی۔ ؟ تمہارے اسی ایڈیٹر صاحب نے میرے گاؤں پہنچنے پر اس نے مجھے چٹھی لکھی۔ تمہاری شوخ چشمی کی داستان بیان کی۔ اور اخباروں کی

امداد کی درخواست کی میں نے اسے سو روپیہ بھجوا دیا۔ اب وہی نمک حرام تمہارے کہنے پر اپنے اخبار میں میری گت بنا رہا ہے۔ افسوس کہ اس نے میرا نام نہیں لکھا، ورنہ میں ہتک عزت کا دعوےٰ کر دیتا۔ بہر حال اب میں تیسرا مربع فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں، تا وقتیکہ تم وفاداری کا دعویٰ نہ کرو۔ فصل کٹ جانے کے بعد آؤں گا۔

چودھری ......

شاعر کا خط

جانِ جہاں!

خدا جانے وہ کیسا زمانہ تھا، جبکہ شعراء کی قدر تھی، قدردان اُمراء کسی شاعر کے ایک شعر پر خوش ہو کر اسے زر و جواہر سے مالا مال کر دیتے تھے۔ اب تو زبانی داد بھی بمشکل ملتی ہے۔ بقول حضرت اکبر مرحوم ؎

بوسہ کیا ان سے گلوری بھی نہیں پاتا ہوں
میں روزانہ نہیں جا کے سنا آتا ہوں
وہ یہ کہتے ہیں، کہ واہ خوب کہا ہے واللہ
میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں!

میں نے آپ کی شان میں نصف درجن قصیدے لکھ کر فلمی رسالوں میں شائع کرائے ہیں اور ان کی کاپیاں بھی آپ کی خدمت میں بھجواتا رہا۔ لیکن آپ سے اتنا نہیں ہو سکا کہ شکریئے کی چٹھی ہی ارسال کر دیتیں۔ میں نے

پچھلے دنوں لکھا تھا۔ کہ اپنے دستخطوں سے اپنی ایک تصویر مرحمت فرمایئے۔
لیکن جواب نہ ملا۔ کیا قدردانی فن اسی کا نام ہے۔؟

سُنا ہے آپ کی سالگرہ قریب آرہی ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک
قصیدہ لکھ کر خود حاضر ہوں گا۔ والسّلام!

خادم......

زندہ ناچ وگانا

خدا بخشے ہمارے بزرگوں نے اپنی زندگی میں ناچ بھی دیکھا ہوگا۔ اور گانا بھی سنا ہوگا۔ لیکن مُردہ ناچ گانے کا تو وہ تصوّر بھی نہ کر سکتے ہوں گے۔ اگر آج ہماری آواز سن سکیں اور ہم ان سے کہیں کہ بھائی دروازہ کے باہر مُردے ناچتے اور گاتے ہیں تو اول ہمیں یہ کہیں گے کہ میاں ہوش کی دوا کرو پاگل ہو گئے ہو لیکن جب ہم قسمیں وغیرہ کھائیں تو ان کا ارشاد یہ ہوگا کہ جس مکان میں ایسا ہوتا ہے وہ آسیب زدہ ہے وہاں جمعرات کو چراغ جلایا کیجئے۔ کلوا پیر کی نیاز دیجئے اور اس مکان میں داخل ہوتے وقت لوہے کی کوئی چیز ہاتھ میں رکھیئے۔

لیکن ان بزرگوں کی اولاد کتنی خوش قسمت ہے کہ انہیں حقیقتاً

مردوں کا ناچ اور گانا دیکھنے کا فخر حاصل ہے اور جب وہ چاہیں چند آنے کا ٹکٹ خرید کر سینما کے پردے پر مُردہ تصویریں، چلتی، پھرتی، ہنستی، روتی، ناچتی گاتی دیکھ سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ انہیں ان آسیب زدہ مکانات میں داخل ہوتے وقت لوہے کی چیز ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لاہور میں ایسے مکانات جن میں ہر رات مُردے زندہ ہوتے ہیں اس کثرت سے ہیں کہ اب اس شہر لاہور کی بجائے مرادآباد کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اور لاہور والے مردہ ناچ اور گانے سے اس قدر سیر ہو چکے ہیں کہ جب کبھی زندہ ناچ اور گانے کا موقع ملتا ہے تو وہ اس پر بے اختیار ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور یہی باعث ہے کہ یہاں کے مُردہ خانوں کے مالک گاہے گاہے زندہ ناچ و گانا کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ جس کے لئے لوگوں کی آنکھیں ترس ترس جاتی ہیں۔

ہم نے زندہ ناچ و گانا صرف بچپن میں بیاہ شادیوں کے موقع پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد مُردوں ہی کی دنیا میں رہتے تھے۔ اس لئے جب ہم نے بازاروں میں اس قسم کے پوسٹر چسپاں دیکھے

ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

"فلم مع زندہ ناچ و گانا"

تو ہم بھی بے اختیار ہو گئے اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات ہم ضرور سینما جائیں گے۔ اور مفت جائیں گے۔ اخبار کے ایڈیٹر تو تھے ہی۔ اس لئے فلم شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے ہم نے ٹیلی فون ہاتھ میں لیا۔ اور

اس سینما ہال کا نمبر ملایا۔ جس میں زندہ ناچ گانا ہونے والا تھا۔

اب ایک مصیبت یہ ہے جس کے خلاف اسمبلی میں سوال اٹھایا جانا نہایت ضروری ہے کہ سینما کے منیجر فلم شروع ہونے سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے یا تو ٹیلی فون کا ریسیور اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ ان سے نمبر ہی نہ مل سکے۔ یا تو یہ جواب ملتا ہے کہ منیجر صاحب ذرا باہر تشریف لے گئے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تک ٹیلی فون کیجیئے۔"

آپ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹیلی فون کریں۔ تو پھر یہی جواب ملتا ہے۔ اس کے بعد بار بار یہی جواب ملتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ سینما کے دونو شو ختم ہو جاتے ہیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ پنجاب لیجلیٹو اسمبلی میں جب اخبار نویسوں کے نمائندے بھی موجود ہیں تو ایڈیٹروں کی اس توہین کا انسداد کیوں نہیں کرایا جاتا اور وزیر اعظم سے اس کے متعلق سوالات کیوں نہیں پوچھے جاتے۔؟

ہم توقع رکھتے ہیں کہ آل انڈیا فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن رتن چند روڈ لاہور اس مسئلہ پر غور کر کے مکمل رپورٹ پیش کرنے کیلئے ایک سب کمیٹی مقرر کرے مولانا ظفر علی خاں (مرکزی) اور مہاشہ دیش بندھو میں سے کوئی صاحب اپنی اسمبلی میں ایک "سینما ٹیلی فون بل" پیش کرنے کا نوٹس دیں۔ ہم تمام "مصیبت زدگان ٹیلی فون" کی تائید و حمایت ان کے ساتھ ہوگی۔

تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہم نے سینما والوں کو ٹیلی فون کیا لیکن اس کا وہی حشر ہوا کہ جس کی امید تھی۔ یعنی منیجر صاحب پکوڑیاں کھانے بازار چلے گئے تھے۔ ہم نے کئی بار ٹیلی فون کیا۔ لیکن جواب یہی ملتا رہا کہ ابھی تک نہیں آئے۔ ہم نے تنگ آکر فیصلہ کر لیا۔ کہ خود سینما پہنچ جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہم دفتر سے اٹھے اور چھڑی گھماتے سینما ہال پہنچ گئے۔

منیجر کا دروازہ نیم کھلا اور نیم بند تھا۔ لیکن منیجر صاحب الواقعہ کمرے میں موجود نہ تھے۔ البتہ سینما کا ہر ملازم آج منیجر نظر آتا تھا کیونکہ ہم جس سے آنکھ ملاتے تھے وہی منھ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ ہم کھسیانے سے ہو کر ان تصاویر کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگے جو سینما ہال کی ڈیوڑھی میں لٹک رہی تھیں۔ تاکہ دوسرے تماشائی یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم مفت پاس کی توقع میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بلکہ یہ خیال کریں کہ ہم "پسند" کر رہے ہیں۔

ہم تصویریں بھی دیکھتے جاتے تھے۔ اور ہر دو لمحے کے بعد منیجر کے کمرے کی طرف دزدیدہ نگاہ بھی دوڑا لیتے تھے۔ آخر اکتا کر ہم نے ایک پتلون پانز صاحب سے جو سینما کے ملازم معلوم ہوتے تھے۔ پوچھا کہ جناب منیجر صاحب کہاں ہیں۔؟

انہوں نے جواب دیا۔ کہیں باہر گئے ہیں۔ ہم کچھ اور پوچھا ہی چاہتے تھے کہ ہماری نظر ہال کے ایک دروازے پر پڑی منیجر صاحب وہاں سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے اور دو آدمی ان کو اپنی اوٹ میں لئے ہوئے تھے۔

شاید اس لئے کہ منیجر صاحب پر کسی کی نظر بد نہ پڑ جائے۔ ہم دور سے ہی چلا اٹھے۔
"آداب عرض جناب"

منیجر صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ اشارہ کر دیا کہ اندر آ جائیے۔

ہم منیجر صاحب کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے کمرے کے دروازے کو اچھی طرح بند کر لیا۔ اور کہا کہیئے مزاج کیسا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہمارے مزاج کو تو چھوڑیئے۔ آپ بتائیے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہیں ایشور نخواستہ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ تو جاری نہیں ہو چکا۔؟ منیجر صاحب بولے اجی حاجی صاحب کیا عرض کروں۔ ان کمبخت مفت خوروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ خدا ان کا ستیاناس کرے۔

ہم نے چاہا کہ سینما دیکھنے کا ارادہ ترک کر کے منیجر صاحب کی بد دعا سے بچ جائیں۔ لیکن زندہ "ناچ گانا" کی کشش غالب تھی اس لئے ہم خاموش رہے۔

منیجر صاحب نے کہا۔
"فرمایئے کیسے آنا ہوا۔؟"

ان کے اس تجاہل عارفانہ کے قربان ہی تو ہو گئے۔ وہ ہماری شانِ نزول کو جانتے تھے۔ لیکن ہماری زبان سے "اعتراف بد نیتی" کرانا چاہتے تھے۔ ہم نے کہہ دیا کہ آج سینما دیکھیں گے۔ ہم نے زندہ ناچ گانا کبھی نہیں

دیکھا۔

منیجر صاحب نے ہمیں ایک چٹ فسٹ کلاس کے لیئے لکھ دی اور ہم ان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے۔ منیجر صاحب نے ہمیں نکال کر دروازہ بند کر لیا۔

ہم نے فسٹ کلاس کے گیٹ کیپر کے پاس جا کر اسے ٹکٹ دکھائی تو اس نے اگلے دروازے کی راہ دکھائی۔ اسی طرح دربدر ہوتے ہم اس دروازے پر پہنچ گئے جو "جنگل محل" کو جاتا ہے۔ یہاں کے گیٹ کیپر نے ٹکٹ دیکھ کر دروازے کا پردہ ہٹایا اور کہا تشریف لے جایئے اندر جا کر ہمیں پہلے تو بڑا غصہ آیا۔ اور ہم نے سوچا کہ یہیں سے واپس چلے جائیں اور کل اپنے اخبار میں اس سینما کے منیجر کے خلاف ایک دھواں دار مضمون لکھیں جس نے ہمیں دو آنے کلاس کا پاس دے کر ہماری ہتک کی لیکن پھر جی میں آیا کہ ذرا اس کا باعث تو دریافت کریں۔

چنانچہ ہم نے گیٹ کیپر سے کہا۔ کیوں صاحب ہمیں پاس تو فسٹ کلاس کا ملا ہے لیکن ہمیں ادنیٰ درجے میں کیوں بٹھایا جا رہا ہے۔؟

گیٹ کیپر صاحب مسکرا کر بولے۔ "آج زندہ ناچ گانا" ہے نا۔ اس لیئے فسٹ کلاس والوں کو سب سے آگے جگہ دی جاتی ہے تاکہ وہ قریبی منظر سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔"

ہم اس بات کا یقین نہ کرتے لیکن "قریبی منظر" اور "لطف اندوز" کے الفاظ سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ آدمی شریف ہے۔ اور شاید کوئی

برخاست شدہ ایڈیٹر ہے۔

ہم اندر داخل ہوئے اور جب تمام حال میں نگاہ دوڑائی تو ایسا معلوم ہوا کہ مزدوروں کو خود مختار حکومت مل چکی ہے۔ کیونکہ جس درجے میں بڑے بڑے طرّہ باز اور سوٹڈ بوٹڈ سرمایہ دار بیٹھا کرتے تھے وہاں آج میاں معراج الدین، پہلوان سراج الدین چودھری گاما اور خلیفہ اچھا وغیرہ بیٹھے تھے۔ اور جو درجہ جھنگڑ محلہ کہلاتا ہے۔ اس میں آج زرق برق ساڑھیوں والی دیویاں اور خوش پوش دیوتے براجمان تھے۔ گویا جھنگڑ محلہ بدل کر محلہ دارا شکوہ بن چکا تھا۔ ہم نے اپنے دل میں نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد۔"

اور ایک "خونخوار" دیوی کی زد سے دور ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

فلم شروع ہوئی۔ لیکن وہی تصویریں جو دور سے خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ قریب سے بھدی نظر آنے لگیں۔ اور ہم نے ارادہ کیا کہ یہاں سے اٹھ کر اپنے مزدور بھائیوں کے درجہ میں جا بیٹھیں۔ لیکن ہم اٹھے ہی تھے۔ کہ پچھلی قطاروں سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"اوئے اوئے۔ بیٹھ جا۔" ہم نے سمجھا کہ شاید یہاں بیٹھ کر اٹھنا ممنوع ہے۔ اس لئے پھر بیٹھ گئے اور طوعاً و کرہاً فلم کو دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہال میں روشنی ہوگئی۔ اور سٹیج جگمگا اٹھا۔

ہارمونیم طبلہ اور دوسرے ساز بجنے لگے اور ڈھنگ سے ایک تیتری تھرکتی ناچتی نکلی۔

اس نے دس پندرہ منٹ تک وہ اودھم مچایا کہ ہمیں اس کی ٹانگوں پر رحم آنے لگا۔ اس کے بعد دو تین دفعہ پھر فلم کے دوران میں جلوہ افروز ہوئی۔ اور ناچتی گاتی رہی۔ ہمیں اس کے ناچ گانے سے کوئی خاص لطف حاصل نہ ہوا البتہ بقول لالہ کرم چند اس کی صحت اچھی تھی۔

فلمی غزل

تو نہیں گر سامنے تیرا کلوز اپ دل میں ہے
روبرو بے روبرو جاں ہر طرح مشکل میں ہے

پردۂ سیمیں پہ ہے سِن سینتیس کے مجنوں کا نجد
کون کہتا ہے کہ لیلےٰ پردۂ محمل میں ہے

لی ترے میک اپ نے میری تیرہ بختی مستعار
یہ سیاہی کچھ ترے ابرو میں اور کچھ تل میں ہے

بیسیوں آنکھیں ہیں کیمروں کی طرح مصروفِ دید
گویا اک ہنگامہ "زاشوٹنگ" تری محفل میں ہے

پھر ذرا تیری اداکاری کا منظر دیکھ لے
مرتے مرتے آرزو اتنی دلِ بسمل میں ہے

اس پری کے عشق میں سو فیصدی روتا ہوں میں
عشق کامل کا مزا ابھی گریۂ کامل میں ہے
کیوں چڑھایا آسماں پر ان کو کہہ کہہ کر سٹار
اب دماغ ان کا فلک کی ساتویں منزل میں ہے
ان پری رویان فلمستاں سے امید وفا
اے دل گم گشتہ تو کس سعی لاحاصل میں ہے
کاٹ کر رکھ لو گے تم اخبار سے تصویر یار
جانتے ہیں ہم بھی تو تو تمہارے دل میں ہے

فلمی ادب کثیف

میں کون ہوں ۔؟
بے تکٹ فلم دیکھنے والا فلمی رسیا ـــــ تیرے فراق کی داستانیں سنانے والا ناطق فلم ـــــ فریادوں سے بھرا ہوا آرکسٹرا ـــــ پس موسیقی ۔!

میں کون ہوں ۔؟
داستانِ غم کا چلتا پھرتا فلمی پوسٹر ـــــ افسانۂ عشق کا ڈایالاگ ـــــ شکوہ جفا کی سٹوری تشہیر حسن کی رنگین فلم کا ساڑھے پانچ فٹ لمبا ٹکڑا ۔

آہ ! وہ گھڑی کیسی منحوس تھی ـــــ وہ ساعت کسقدر دل خراش تھی ـــــ وہ سینما ہال کتنا جفا کار تھا ـــــ وہ فلم کس بلا کی ستم آفریں تھی ـــــ جب میں نے تمہیں پردہ سیمیں پر ایکٹ کرتے دیکھا۔
آہ وہ منحوس گھڑی ـــــ

تم ایکٹ کر رہی تھیں میرے دل پر ناز و ادا کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ ــــ مجھے اپنے حسنِ لق و دق فریب کی چھری سے حلال کر رہی تھیں۔ میری جان پر آفت لا رہی تھیں میں مبہوت تھا۔ ــــ مسحور تھا ــــ دل باختہ تھا بے حواس تھا ــــ بے زر تھا ــــ حتیٰ کہ بے ٹکٹ تھا۔

میں نے بے خودی کے عالم میں ہاتھ پھیلائے ــــ تمہارے عکس کی طرف ــــ عالمِ خیال میں تجھے ہم آغوش کر لیا ــــ اور ــــ آنکھیں بند کر لیں ــــ دو لمحے کے بعد میں نے آنکھیں کھول لیں ــــ میری خیالی آغوش کا ستیا ناس ہو چکا تھا ــــ یعنی سامنے ماسٹر ہادی اپنی نوکدار مونچھیں ہلا ہلا کر ــــ بھاؤ بتا بتا کر غزل گا رہا تھا۔

آہ! تمہیں کیا خبر کہ میں ــــ مایوسیوں کا پُتلا ــــ ارمانوں کا تھیلا ــــ حسرتوں کا مال گودام ــــ تیری تصویر کو بغل میں دبائے ہوئے ــــ جو "فلمستان" میں چھپی تھی ــــ اخباروں کے دفتروں میں جوتیاں چٹخارتا پھرتا ہوں ــــ ایڈیٹروں کی خوشامدیں کرتا ہوں انہیں مُفت مضمون لکھ لکھ کر دیتا ہوں ــــ تاکہ مجھے مفت فلم دیکھنے کے لئے پاس ملتے رہیں ــــ وہ فلم جس میں تمہارا پارٹ ہو۔!

آہ! میں کون ہوں ــــ کیا ہوں۔؟
تم کون ہو ــــ کیا ہو ــــ اور کہاں رہتی ہو۔؟

چار سو بیس

سولہ سترہ سال غیر ممالک میں رہنے کے بعد جب میں ہندوستان واپس آیا۔ تو میں نے ایک اخبار میں "شری ۸۰۸" لکھا تھا۔ میں نے شری رامچندر جی شری بھگوان وغیرہ تو ہزار دیکھا تھا۔ لیکن "شری ۸۰۸" کے معنی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر یہ خیال کر کے خاموش ہو رہا۔ کہ جس طرح مسلمان چٹھی لکھتے وقت اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے ۷۸۶ سے کرتے ہیں اسی طرح ۸۰۸ میں کسی متبرک ہستی کا نام ہے جسے الفاظ کی بجائے اعداد میں لکھا جاتا ہے۔

چند روز بعد میں نے ٹرین میں دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سُنا۔ ایک کہہ رہا تھا ارے بھئی۔ تمہارا کوچہ پٹ نگاں والا دوست تو بڑا ۴۲۰ ہے۔ میں یہاں بھی "ابجدی گفتگو" سن کر حیران ہو گیا اور سوچنے

لگا کہ ۴۲۰ کیا بلا ہے۔ ؟ آخر جب ہر روز ایک دو دفعہ "۴۲۰" سننے لگا۔ تو مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی شریف آدمی سے اس کا مطلب دریافت کروں۔ آخر ایک روز میں نے ایک شخص سے پوچھ ہی لیا کہ صاحب "۴۲۰" کسے کہتے ہیں۔ ؟ اس بھلے مانس نے چیں بجبیں ہو کر میرے چہرے کی طرف اس طرح دیکھا گویا میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ تیری ایسی تیسی چوسی ہنسی۔"

لیکن شاید اس کی نظر میری معصومیت کو بھانپ گئی اس لئے اس نے مسکرا کر کہا۔ حیرت ہے کہ آپ ابھی تک ۴۲۰ نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو کبھی کسی ۴۲۰ سے پالا نہیں پڑا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ ۴۲۰ تعزیرات ہند کی ایک دفعہ ہے جو فریب کاروں اور جعلسازوں پر عاید کی جاتی ہے اور اس دفعہ کے ماتحت انہیں سزا ملتی ہے یہ سُن کر میں خوش تو اس لئے ہوا کہ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔ اور ہر شخص تعزیرات ہند کی دفعات تک جاننے لگ گیا ہے۔ لیکن افسوس اس بات پر ہوا ——— کہ دفعہ ۴۲۰ سے دیہاتی تک بھی آشنا ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب فریب کاری اور جعلسازی بہت عام ہو گئی ہے۔

ایک روز میں دہلی میں جا رہا تھا۔ ٹرین میں ایک ٹی ٹی صاحب ٹکٹوں کا معائنہ کرنے آئے، میں نے دیکھا۔ کہ ان کے کندھے پر ۴۲۰ لکھا ہے۔ میں نے از راہ تعفن عرض کیا۔

"کہیئے بابو ۴۲۰ صاحب کیا حال ہے۔" بابو صاحب مسکرائے

اور بولے اجی حضرت کیا کیا جائے۔ خود سرکار نے ۴۲۰ بنا رکھا ہے ورنہ یہ خاکسار تو ۴۲۰ نہیں۔" یہ دیکھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ جس شخص کا ٹیلیفون نمبر ۴۲۰ ہوگا۔ تو اس بیچارے کی زندگی بھی کیا ہوگی۔ جب وہ کسی کو اپنا ٹیلیفون نمبر بتاتا ہوگا تو سننے والا مذاق سمجھتا ہوگا اور پھر وہ پولیس والا جس کی پیٹی پر ۴۲۰ لکھا ہوگا۔ فریب کاری وارداتوں میں کس منہ سے تفتیش کرتا ہوگا۔ ؟ جب وہ کسی شخص کو دفعہ ۴۲۰ کا ملزم گردانتا ہوگا تو اسے یہ جواب نہ ملتا ہوگا۔ کہ "جناب آپ کبھی ۴۲۰ ہیں۔

بہر حال آہستہ آہستہ تجربہ ہوتا گیا۔ تو مجھ پر یہ آشکارا ہونے لگا۔ کہ ملک میں ہر طرف ۴۲۰ کا دور دورہ ہے۔ اور پہلے تو دنیا "بہ امید قائم" ہوا کرتی تھی۔ لیکن آج کل دنیا بہ ۴۲۰ قائم ہے۔

ایک واقعہ مجھ سے بھی سنیئے۔ جس کا دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ ۴۲۰ کرنے والے بزرگوار ایک روزانہ اخبار کے مالک ہیں جو اپنا مقصد زندگی خدمت قوم و وطن بتانے کے عادی ہیں۔ اور پھر ۴۲۰ بھی ایسی مکمل ہے کہ نہ کوتوال کا ڈر نہ قاضی شہر کا خدشہ۔

شمالی ہندوستان کے ایک مسلمان بنیئے کو خدمت قوم کا شوق چرایا۔ اور ایک اخبار نویس کی انگیخت پر اس نے روزانہ اخبار نکالنے کا تہیہ کر لیا ہے بنیئے کے لئے سرمایہ کا سوال تو مشکل نہ تھا۔ لیکن موزوں چیف ایڈیٹر کا ملنا ذرا دشوار تھا اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان دنوں ایک مشہور اخبار کا چیف ایڈیٹر علی محمد خاں رندبے کار تھا۔ بلکہ اس کے سابقہ رفقائے کار

بھی تلاش معاش میں سرگرداں تھے بنئے کو پتہ چلا تو اس نے چیف ایڈیٹر صاحب سے ملاقات کی ۔ معاملہ کی گفتگو ہوئی اور بنیئے نے کہا کہ صاحب نیا نیا کام ہے ۔ ابھی میں زیادہ تنخواہ نہ دے سکوں گا ۔ اگر آپ سو روپے ماہوار تنخواہ اور منافع کا ۲۰ فی صدی قبول فرمائیں تو کام شروع کر دیا جائے ایڈیٹر نے کہا کہ سوچ کر کل بتاؤں گا ۔

ایڈیٹر صاحب نے گھر جا کر بیوی کو مژدہ سُنایا کہ لو بلقیس کی ماں! کام ہو گیا سو روپے ماہانہ اور منافع کا ۲۰ فی صدی ۔ یوں سمجھو کہ سو روپے تو سیدھے بنک جایا کریں گے اور منافع دو تین سو روپے ماہانہ سے کم ہونے کا نہیں پہلے ایک ریڈیو سٹ خریدیں گے اور تم جانتی ہو ۔ کہ ایڈیٹر کے لئے ریڈیو سٹ کس قدر ضروری ہے ۔ دن بھر کی دماغی کوفت کے بعد موسیقی کے نغمے اور پھر دنیا بھر کی خبریں بچوں کا پروگرام بھی ہوتا ہے ۔ اور پھر جب میں ریڈیو سٹیشن پر جا کر تقریر براڈ کاسٹ کیا کروں گا تم گھر بیٹھی سن سکو گی ۔ بلقیس جھٹ میری آواز پہچان لیا کریگی اور کہے گی یہ "ابا بول رہے ہیں ۔"

بلقیس کی ماں نے ایک قہقہہ لگایا اور ایڈیٹر صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ دوسرے اور تیسرے مہینے کے منافع کی رقم سے ایک قیمتی قالین خریدیں گے ۔ جو بیٹھک میں پورا آجائے تم جانتی ہو کہ ایڈیٹر کی ملاقات کے لئے بڑے بڑے آدمی آتے ہیں اور خالی دری سے رعب نہیں جمتا ۔ چوتھے مہینے سے منافع کی رقم جمع کرتے جائیں گے اور چند ماہ

کی آمدنی سے ایک موٹر کار خریدیں گے۔ لیکن یاد رکھو کہ تمہارے رشتہ داروں نے بار بار آکر موٹر مانگی تو میں انکار کر دوں گا۔ تمہیں علم نہیں کہ موٹر اسی حالت میں اچھی رہ سکتی ہے جبکہ وہ اپنے ہی استعمال کے لئے مخصوص رکھی جائے لوگ پرائی چیزیں مانگ کر لے تو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی پرواہ نہیں کرتے اور یہ ہوا مشین کا کام ذرا بے احتیاطی کی اور مشین بگڑ گئی۔

اچھا تو موٹر کے بعد کیا خریدیں گے۔؟

بلقیس کی ماں جھنجھلا کر بول اٹھی۔ آپ نے اپنے ہی کام کی چیزیں گن ڈالیں لیکن کچھ میری فکر ہے؟ کوئی زیور، کوئی کپڑا، آپ کے منافع میں کچھ حصہ نہیں۔؟

ایڈیٹر صاحب بولے۔ کیوں نہیں۔ جب یہ ساری چیزیں بن جائیں گی تو پھر تمام منافع تمہارے ہی لئے ہو گا جو چاہو گی بن جائے گا۔

بلقیس نے کہا۔ ابا جی میرے لئے بڑی سی گڑیا بھی لاؤ گے۔؟

ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا بچی گڑیا کے لئے پیسے درکار نہیں ایسی چیزیں اخبار کے دفتر میں ریویو کے لئے مفت آجایا کرتی ہیں۔

اگلے دن ایڈیٹر صاحب نے بنیا صاحب کے پاس جاکر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ معاہدہ لکھا گیا اور اخبار شروع کر دیا گیا۔ ایڈیٹر صاحب نے اپنے پرانے رفقائے کار کو بھی ساتھ لے لیا اور اخبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ پہلا مہینہ ختم ہوا تو بنیا صاحب نے چیف ایڈیٹر صاحب کو تنخواہ دیکر یہ واضح کر دیا کہ منافع سال کے سال تقسیم ہوا کریگا۔ ایڈیٹر

صاحب نے سوچا کہ چلو اکٹھی رقم مل جایا کرے گی اس میں کیا حرج ہے۔

پہلا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے ایڈیٹر کو بیلنس شیٹ حساب آمد و خرچ دکھا کر کہا پہلے سال تو کسی کاروبار میں منافع ہوا نہیں کرتا۔ آئندہ چل کر انشاء اللہ وارے نیارے ہوں گے۔ ایڈیٹر صاحب نے شیٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جس میں منافع کا خانہ خالی تھا اور ہلکی سی آہ بھر کر خاموش ہو رہے۔

دوسرا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ کم بخت اکاؤنٹنٹ ٹرائسٹ ہے ابھی تک اس نے حساب ہی تیار نہیں کیا۔ بہتر ہو کہ اسے علیحدہ کر کے کوئی ہوشیار اکونٹنٹ رکھا جائے ایڈیٹر صاحب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور چند روز میں دوسرا اکونٹنٹ رکھ لیا گیا۔

اس اکونٹنٹ صاحب نے پرانے اکاؤنٹنٹ کے حساب سمجھنے میں ایک سال اور صرف کر دیا۔ اور جب ایڈیٹر صاحب سے مالک سے حسابات دیکھنے کا مطالبہ کیا تو مالک نے کہا کہ حساب تیار ہو رہا ہے گھبرائیے نہیں۔ غرض ایک سال اور گذر گیا اور حساب تیار نہ ہوا۔ ایڈیٹر صاحب حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے بہر حال اسی ٹال مٹول میں چار سال گذر گئے اور ایڈیٹر صاحب کو منافع کا ایک روپیہ تک وصول نہ ہوا۔ آخر جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بنیے نے کہا۔ کہ صاحب بات دراصل یہ ہے کہ ان چار سال میں ہمیں نقصان ہی ہو رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو وہ

حساب دیکھ لیجیئے جو ہم نے انکم ٹیکس والوں کے لیئے تیار کیا ہے ایڈیٹر صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ کہ لائیے وہی دکھائیے۔ لیکن مالک بولا۔ کہ جناب وہ بھی تا حال تیار نہیں۔"

ایڈیٹر صاحب بہت سٹ پٹائے اور انہوں نے دل کڑا کر کے نکتہ چینی شروع کر دی۔

ایڈیٹر :۔ ابھی حضرت آپ فرما رہے ہیں کہ چار سال میں کوئی منافع نہیں ہوا۔ اور آپ یہ بھی ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ آپ نے اپنی تمام پونجی اخبار میں لگا دی ہے پھر یہ جو آپ نے مکان تعمیر کر لیا ہے اس کی لاگت کہاں سے آئی۔

مالک :۔ مکان بے شک اخبار ہی کی آمدنی سے بنایا گیا۔ لیکن اسے اخبار ہی کا خرچ سمجھیئے۔

اگر میرا مکان شاندار ہو گا تو اس سے اخبار ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کلاں کو اخبار پر خرچ کرنے کے لیئے مزید روپے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مکان ہے۔ تو جہان ہے۔ ہر جگہ قرض مل سکتا ہے گویا میرا مکان بنانا اخبار ہی پر احسان تو ہے ورنہ میرے رہنے کے لیئے کیا پرانا کھنڈر کافی نہ تھا۔

ایڈیٹر :۔ اور وہ جو آپ نے اپنے ایک عزیز کو ولایت بھیجنے پر پانچ ہزار روپیہ ضائع کر دیا۔

مالک :۔ وہ بھی اخبار پر احسان ہے اور اخبار ہی کے مصارف

میں شمار ہوتا ہے کیونکہ توقع تو یہ تھی۔ کہ میرا عزیز ولایت سے بڑا افسر بن کر آئے گا۔ اور اس کے ذریعہ اخبار کو سرکاری اشتہارات مل جائیں گے یہ قسمت کی بات ہے کہ کامیابی نہ ہوئی ورنہ ارادہ تو نیک تھا۔

ایڈیٹر :۔ اور آپ نے جو موٹر خرید لی ہے۔؟

مالک :۔ (قہقہہ لگا کر) آپ بھی بڑے بدگمان واقع ہوئے ہیں اجی جناب یہ دیکھیے میرا جوتا کس قدر بوسیدہ ہو رہا ہے کہ اگر میں موٹر نہ خریدتا تو پیدل چلتے چلتے یہ جوتا بالکل پھٹ جاتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ نیا جوتا خریدنے کی ہمت نہ تھی یہ اقتصادی مسائل ہیں۔ اگر آپ انہیں سمجھ نہیں سکتے تو یہ آپ کا قصور نہیں۔ تمام اہل قلم کاروباری معاملات میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر :۔ اور آپ نے اپنے ایک عزیز کی شادی پہ چار ہزار روپیہ کہاں سے صرف کیا۔؟

مالک :۔ اخبار کی آمدنی سے اور وہ اس لئے کہ دلہن مڈل پاس تھی خیال تھا کہ اخبار کا زنانہ کالم لکھا کرے گی۔ کیا یہ اخبار پر احسان نہیں اور یہ روپیہ اخبار کی آمدنی سے خرچ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ایڈیٹر یہ جوابات سن کر دم بخود ہو گیا اور اگلے دن اس نے استعفا داخل کر دیا اور ساتھ ہی نہایت فراخ دلی سے کام لے کر اپنے حقوق و مواجب سے وہ دست برداری کا پروانہ بھی لکھ دیا۔ جان بچی لاکھوں پائے اب یہ ایڈیٹر صاحب ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ جس کا نام ”۴۲۰“ ہوگا۔

چونگی خانہ

لاری کے سفر میں سب سے کٹھن گھڑیاں وہ ہیں جو محصول کی چوکی پر گذرتی ہیں۔ چونگی خانہ کے چپراسی لاری پر پل پڑتے ہیں اور اس طرح تلاشی لیتے ہیں کہ ساری کی ساری لاری گویا کین فروشوں سے لدی ہوئی ہے۔ ایک چپراسی اچک کر لاری کی چھت پر چڑھ جاتا ہے اور اوپر کا جائزہ لیتا ہے۔ ایک ایک کی ٹانگیں اٹھوا کر سیٹوں کے نیچے نگاہ دوڑاتا ہے۔ اور اگر دو چار مسافروں کے پاس سے قابل اشیاء برآمد ہو جائیں تو محصول کی ادائیگی میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ باقی مسافر تنگ آ جاتے ہیں۔

محصول کی چوکی پر بعض اوقات دلچسپ واقعات ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گرانڈیل دیہاتی کے پاس کوئی ایک سیر گھی تھا۔ چونگی کا چپراسی اسے محرر کے پاس لے گیا۔ محرر نے گھی تولا اور پرچی لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جب اس نے پرچی لکھ کر

ختم کی اور جاٹ سے محصول طلب کیا تو جاٹ نے پوچھا۔

جاٹ :- محصول کس چیز کا ۔؟

محرّر :- گھی کا ۔

جاٹ :- گھی کہاں ہے ؟

محرر :- اس برتن میں ۔

جاٹ برتن محرّر کے سامنے رکھ دیتا ہے ۔ اور محرّر نے برتن کے اندر نگاہ ڈالی تو برتن خالی تھا ۔ جاٹ گھی کو پی گیا تھا ۔

ایک دفعہ ایک مسافر امرت سر سے نیا بوٹ خرید کر لایا تھا ۔ لاہور کے چونگی خانہ پر حسب معمول چپڑاسی اسے محرّر کے پاس لے گیا اور کہنے لگا ۔ کہ "نیا بوٹ" چپڑاسی یہ کہہ کر دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا ۔ اور محرّر پرچی لکھنے لگا ۔ لیکن مسافر نے ان کی بے توجہی سے فائدہ اٹھا کر اپنا پھٹا پرانا جوتا اتار کر بڑے زور سے ساتھ دور پھینک دیا اور نیا بوٹ پہن لیا ۔ اب محرّر صاحب محصول کے لئے تقاضا کر رہے ہیں ۔ اور مسافر کہہ رہا ہے کہ پہنے ہوئے بوٹ کو محصول نہیں لگ سکتا ۔ یہ ایک تماشا بن گیا ۔ سب مسافر جمع ہو گئے اور مسافر کی حمایت کرنے لگے ۔ چپڑاسی ڈھونڈ ڈھونڈ کر مسافر کا پرانا جوتا اٹھا لائے اور بوسیدہ جوتا کون پہن سکتا ہے ۔ تم میری توہین کر رہے ہو ۔"

ایک مسافر بولا " ارے میاں تم دیکھتے نہیں ۔ یہ سفید پوش آدمی ہے وہ ایسا ذلیل جوتا پہن سکتا ہے ۔ ؟ سب لوگوں نے اس کی تائید کی اور ایک مسافر نے تو یہاں تک کہہ دیا ۔ کہ میں نے اس نوجوان کو لاری میں

بنا بوٹ پہنے دیکھا۔

محرّر نے پہلے تو بہت زور دکھایا۔ لیکن بالآخر کھسیانا ہو کر بولا اچھا یہ چٹھی لکھی جا چکی ہے۔ اب جرمانہ مجھے اپنی جیب سے ادا کرنا ہو گا۔ مسافر لاری پر سوار ہو گئے۔ اور محرّر نے اپنی جیب سے پیسے نکال کر صندوقچی میں ڈال دیئے۔

ایک اور واقعہ سنئے ایک دفعہ ایک دیہاتی شہر کو گھی کا ٹین لے جا رہا تھا۔ کہ محرر چونگی نے اسے بہت تنگ کیا۔ جاٹ نے دل میں ٹھان لی کہ اس سے بدلہ لے گا۔ چنانچہ کچھ روز کے بعد گھی کے دو ٹین لے کر آیا۔ اور جب محرّر نے محصول مانگا۔ تو اس نے کہا میرے پیسے کہیں راستہ میں گر گئے ہیں۔ محرّر ڈانٹ کر بولا کہ ہم کیا کریں۔ جہاں سے ہو سکتا ہے لاؤ۔ جاٹ نے کہا۔ اچھا سامنے والے گاؤں میں میرا رشتہ دار رہتا ہے۔ اس سے پیسے لا دیتا ہوں۔ تم گھی کے ٹین اپنے پاس بطور امانت رکھو محصول ادا کر کے لے جاؤں گا۔

جاٹ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ اس نے محصول ادا کر دیا۔ اور کہا ذرا دیکھ تو لوں تم نے میرا گھی تو نہیں چرا لیا۔؟ یہ کہہ کر اس نے ایک ٹین کھولا اور ایک لکڑی سے اس کا جائزہ لیا۔ دفعتہً اس کی چیخ نکل گئی۔ اور بولا "یہ بے ایمانی۔ دیکھو میں لٹ گیا۔"

وہاں ایک لاری کے کئی مسافر کھڑے تھے۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے تو انہوں نے دیکھا۔ کہ ٹین میں اوپر گھی کی پتلی سی تہ ہے اور نیچے مٹی

جاٹ نے شور مچاتے ہوئے دوسرا ٹین کھولا۔ تو اس کا بھی یہی حال محرر بولا کہ ہم نے تو ٹینوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ جو کچھ ہے تمہارا مال ہے اور جوں کا توں پڑا ہے اس پر جاٹ نے مسافروں سے مخاطب ہو کے روتے ہوئے کہا۔ " دیکھو یارو کبھی کوئی مٹی کے ٹین بھر کر بھی شہر میں بیچنے آتا ہے۔"

سب لوگوں کی ہمدردی جاٹ کے ساتھ ہو گئی۔ کیونکہ وہ خوب ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اور سر پیٹ رہا تھا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ پولیس کو اطلاع دی جائے پولیس کا نام سن کر محرر کانپ اٹھا۔ اور اس نے گھی کی قیمت ادا کرنا منظور کر لیا۔

محصول بعض اوقات مشقت کی صورت میں بھی منظور کر لیا جاتا ہے ایکدفعہ ایک چوکی پر ایک شخص کو محصول کے لیے روکا گیا۔ محصول کی رقم دو آنے تھی مسافر کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ محرر نے پوچھا۔ تمہاری ذات کیا ہے۔ مسافر بولا کہ ماشکی ہوں۔ محرر نے کہا۔ اچھا یہ گھڑا اٹھاؤ وہ دور کنواں ہے وہاں سے بارہ گھڑے پانی لاکر اس مٹی میں ڈالدو۔

وہاں نئی چوکی تعمیر ہو رہی تھی۔ اور مٹی سے گارا بنانا منظور تھا۔ چنانچہ ماشکی نے بارہ گھڑے پانی بھر کر جان چھڑائی۔

ایک چوکی کا محرر برہمن تھا۔ اور ایک مسلمان کو اس سے کچھ پرخاش تھی پرخاش کی وجہ یہی کہ کوئی محصول کا جھگڑا تھا۔ ایک دن مسلمان ایک گٹھڑ سر پر اٹھائے ہوئے چوکی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ محرر نے راستہ روکا۔ اور کہا کہ کیا ہے یہ؟ محصول دیئے جاؤ۔ مسلمان نے اکڑ کر کہا۔ کہ ہم

محصول ڈول کچھ نہیں دیا کرتے محرر نے بڑھ کر کہا۔ تمہارا باپ بھی دیگا مسلمان آگے چلنے کو تھا کہ محرر نے بڑھ کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اور کھینچتا ہوا اپنے تخت پوش تک لے آیا۔ مسلمان نے کہا۔ دیکھو پنڈت! ہاتھ چھوڑ کر بات کرو۔ میرے سر سے گٹھری گر جائے گی۔

محرر بولا۔ کہ میں اسے گرانا چاہتا ہوں۔ تا کہ دیکھوں کیا ہے۔؟

تکرار بڑھ گئی۔ اور جب ذرا زیادہ گرمی پیدا ہو گئی تو مسلمان نے گٹھری تخت پوش پر گرا دی۔ اور جلدی سے گٹھری کا کپڑا کھول کر اپنے کندھے پر ڈال دیا۔ اور چل دیا۔

محرر نے مسلمان کے مال پر نگاہ ڈالی تو بو کھلا گیا۔ یہ بکرے کے پائے تھے۔ اب برہمن منتیں کر رہا تھا کہ بھائی اسے اٹھاؤ یہاں سے لیکن مسلمان نے ایک نہ سنی اور بھاگ گیا۔

ایک دفعہ دو اشخاص کو چونگی خانہ پر ٹھہرایا گیا۔ ایک کے پاس نیا ٹرنک تھا اور دوسرے کے پاس نیا لباس۔ محرر چونگی نے محصول طلب کیا تو انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جائیے پیسے ہمارے پاس نہیں ہمارے تیسرے ساتھی کے پاس ہیں جو پیچھے آرہا ہے۔ محرر نے انہیں ایک طرف بٹھا کر ساتھی کا انتظار کرنے کو کہا۔ اور آپ اپنے کام میں لگ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں مسافر محرر کے سامنے آئے اور بولے کہ لیجئے ہم چلدیئے محرر نے کہا۔ محصول۔ ایک مسافر نے کہا محصول کس چیز کا؟ آنکھیں کھول کے دیکھو۔ محرر نے دیکھا کہ ایک شخص نے نیا لباس پہنے

ہوئے ہے اور دوسرے کے ٹرنک میں پرانے کپڑے پڑے ہیں۔ گویا دونوں چیزیں
مستعمل ہو چکی تھیں۔ اور مستعمل چیز پر محصول نہیں لگتا۔

ایک لاری کا مسافر پھلوں کی ایک ٹوکری لایا محرر چونگی نے ٹوکری
کو تولا اور اس کا محصول اس قدر بتایا جو پھلوں کی لاگت سے کچھ ہی کم تھا اس
پر مسافر نے جھٹ ٹوکری کھولی۔ اور پھل سارے مسافروں میں تقسیم کرا دیئے محرر
تکتا رہ گیا۔

گوجرانوالہ میں جہاں آجکل بعضوں پر بھی محصول لگ گیا ہے مٹی کے نئے
برتنوں پر بھی محصول تھا۔ ایک دفعہ ایک بڑھیا تین پیسے کی پسرور کی ہنڈیا لئے
چونگی خانہ سے گذری تو اس سے دو پیسے محصول طلب کیا گیا۔ بڑھیا نے کہا۔
"منشی جی"! یہ ہنڈیا میں آپ ہی کے لئے سوغات لائی ہوں اسے رکھئے ۔۔
بڑھیا ہنڈیا محرر کے تخت پوش پر دھر کر روانہ ہو گئی۔

ماڈرن غزل (۲)

منزلِ جاناں پہ میں چڑھتا اترتا کو گیا
بات مطلب کی جو اگلی تھی کہ جوتا چل گیا

چھان مارا جستجو میں ان کی سواری کون باغ
پوچھتا پھرتا رہا ہوں گیا کوئی ادھر سائیکل گیا

سامنے میرے ہی دلبر نے جھپٹ کر چپ کریم
اس طرح گویا دو میرے دل پہ گھونسہ مل گیا

کیا ہی سادے تھے وہ اب چلتے پرزے ہو گئے
چال ٹھمکی کی اتنا دوپٹے سے پردہ ڈھل گیا

آہ سوزاں کی ذرا تاثیر دیکھا چاہیے
آہ میری نے کی جہاں ان کا سگرٹ جل گیا

بیچ کر ٹوپی کہ ٹیکسی کا کرایہ بن سکے
دیکھنے کیا اُن کے کوچے تک میں بس سے پیدل گیا

کھانے پینے پہ نہیں لق لق مدارِ زندگی
کوئی کیا جانے کہ میرا پیٹ تو غم سے ہی ڈھل گیا

ماڈرن غزل (۳)

حال تیرے ہجر میں کیا دیکھ دل بہ ہوگیا
روتے روتے میرا اوور کوٹ بھی تر ہوگیا

رات دن ہوتا ہے میرے دل کے ارمانوں کا خون
دل میرا بھی شومئی قسمت سے سکھر ہوگیا

میری کیا جرأت ہائے دلبر پا سکوں!
شکل کا انساں تھا دم چلنے میں موٹر ہوگیا

ہر گھڑی دیتا ہوں تیرے ملنے والوں کو صدا
تیرا دربان کیا بنا جی میں نوکر ہوگیا

لے ہی آئی یار کو میری کشش گھر پر مرے
یہ بھی گویا معرکہ طبروق کا سر ہوگیا

حسن کی تذکیر اور تانیث بھی جاتی رہی
روز سنتے ہیں فلاں ما وہ تھا اور نر ہوگیا

سوٹ پہنے دیکھ کر مجھ کو کہا اس شوخ نے
واہ تو تو خوب اب حاجی سے مسٹر ہوگیا

وہ آگیئں

جب سے کالجوں میں تعلیم مخلوط ہوئی ہے اکثر ادبی رسائل بھی مخلوط ہو گئے ہیں۔ آپ کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی فہرست مضامین پر نظر دوڑائیے اس میں دس نام مرد اہل قلم کے ہونگے تو دو چار خواتین کے اسمائے نازک بھی نظر آئیں گے۔

کالجوں کی مخلوط تعلیم جس "بے تکلفی" کا موجب بنتی ہے۔ مخلوط رسائل بھی اسی قسم کی "رواداری" کا باعث بنتے ہیں۔ زید نے ایک نظم لکھی۔ اور زبیدہ نے ایک افسانہ لکھا۔ دونوں ایک ہی رسالہ میں چھپے اور نتیجہ یہ ہوا کہ زید اور زبیدہ خود ایک دلچسپ افسانہ بن گئے۔

لاہور میں ایک نامور ادیب کی شادی ایک مشہور ادیبہ سے اسی "مخلوط نویسی" کے باعث ہو چکی ہے۔ ادیبہ نے ایک مضمون لکھا ادیب نے اس کے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اسی طرح ایک دوسرے پر دو تین

دار ہوئے اور دونوں شہید ہو کر رہ گئے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ بیوی شوہر بن گئے اور وہ رسالہ جس میں ان کے مضامین چھپے تھے اچھا خاصہ شادی ایجنسی ثابت ہوا۔

ہمارے ارشد مرزا بھی اسی مخلوط نویسی کا شکار رہیں۔ ایک ادبی رسالہ میں ان کی اور ایک دہلوی لڑکی مس رفیقہ کی نظمیں چھپتی رہیں۔ اور رفتہ رفتہ دونوں ہم قافیہ مصرعے بن گئے۔ لیکن وزن میں ذرا فرق نہ تھا۔ اس لیے دونوں نے فعولن فعولن کی رٹ لگا کر عرصہ دراز میں وزن درست کیا۔ مرزا ارشد کی راہ میں یہ مشکل حائل تھی کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ تین چار بچوں کے باپ بھی تھے بہر حال مصرع ثانی نے مصرع اولیٰ کا یہ "الطاف علی" قبول کر لیا اور یہ طے پایا کہ دونوں مصرعوں کو ملا کر ایک کھلی اور موزوں شعر بنا دیا جائے۔

حسب تجویز ارشد مرزا نے اپنے بھائی کو تار بھیجا جو حسب ذیل تھا۔

ALLWELL COME IMEDIATLY یعنی ہر طرح خیریت ہے آپ فوراً تشریف لائیے۔ ارشد مرزا نے ہر طرح خیریت کے الفاظ اس لئے جڑ دیئے تھے کہ کہیں بھائی صاحب پریشان نہ ہو جائیں کہ کیا معاملہ ہے ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں صرف آپ اکیلے آ جائیے لیکن گاؤں میں تار کا آنا ایک مصیبت ہوتا ہے ہر چند آصف مرزا لکھے پڑھے آدمی تھے اور تار میں صاف لکھا تھا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ لیکن آپ گھبرا گئے کہ خدا جانے بھائی کے سر پر کیا مصیبت آ پڑی ہے۔ اسی گھبراہٹ میں آپ نے تار کو ارشد مرزا کے سسرال روانہ کر دیا۔ جہاں ارشد مرزا کے

الب بچ گئے ہوئے تھے۔ اور ستم یہ کیا کہ تار کا اردو ترجمہ نہ لکھا۔ اب یہ چھوٹا سا گاؤں جس میں ایک پٹواری اور ایک مدرس۔ لڑکا تار کو پٹواری کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ کہ میں رومن کیرکٹر تو جانتا ہوں اور ان حروف کو پڑھ سکتا ہوں۔ لیکن معنی نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ ایک لفظ کے معنی جانتا ہوں۔ اور وہ "لاہور" ہے یہ تار لاہور سے آیا ہے۔

گاؤں میں تار آجائے تو گھر گھر میں گھبراہٹ پھیل جاتی ہے اور بعض اوقات ان دنوں کوئی رشتہ دار بیمار ہو یا لڑائی وغیرہ میں گیا ہوا ہو تو تار پڑھائے بغیر رونا پیٹنا شروع ہو جاتا ہے ارشد مرزا کے گھر والوں میں بڑی پریشانی پھیلی رہی تھی کہ مجید مرزا آگئے۔ جو ارشد مرزا کے رشتہ دار تھے اور زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔

لڑکے نے تار دیکھ کہا بھائی اس تار کو نہ پٹواری پڑھ سکا ہے۔ نہ مدرس، مجید مرزا بولے "اجی واہ تار کا پڑھنا کوئی آسان کام ہے؟ اس کے لئے قابلیت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں حروف حذف کر کے اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور حذف شدہ الفاظ کو جان لینا ایسے ویسوں کا کام نہیں۔ اگر پٹواری اور مدرس تار پڑھنے لگیں تو ہم انٹرنس پاس لوگوں کو کون پوچھے گا۔"

مجید مرزا نے عینک نکالی اور اسے آنکھوں پر لگا کر تار کو بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ بلند آواز سے اس لئے کہ انہیں اپنی انگریزی دانی کا لوہا منوانا تھا۔

پہلا لفظ ہے ALL اس کے معنی ہیں سب کے سب یا تمام اس کے آگے ہے WELL یہ فالتو لفظ ہے انگریز لوگ اکثر اردو بولتے وقت بھی اسکو استعمال کیا کرتے ہیں۔ ویل تمہارا کیا نام ہے اس کے بعد ہے come immediately اس کے معنی ہیں فوراً چلے آؤ۔ تو سارے تار کا مطلب یہ ہوا کہ سب کے سب چلے آؤ۔"

اب ارشد مرزا کی سنئے وہ اپنے گھر دو تین ہمراز دوستوں میں بیٹھے نئی شادی کے متعلق گپ شپ ہانک رہے تھے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دیکھئے آخر خدا وہ وقت لے ہی آیا کہ میرے دل کی مراد پوری ہونے کو ہے۔ بھائی جان لمبی آہیں بھرتے ہی رہ گئے۔ وہ آئے اور میں انہیں لے کر دہلی پہنچا۔ اور پھر سمجھ لیجئے کہ وہ بھی آگئیں ——— میری نئی بیگم صاحبہ۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی ارشد مرزا باہر نکلے اور پھر اندر آکر دوستوں سے کہنے لگے۔ اب آپ تشریف لے جایئے وہ آگئیں۔

الطاف :۔ "وہ کیسے آگئیں ابھی تک آپ کے بھائی صاحب تو آئے نہیں اور آپ دہلی گئے نہیں وہ کیسے آگئیں۔؟"

ارشد مرزا :۔ ارے وہ آگئیں ——— وہی پرانی بیگم صاحبہ!

ادبِ کثیف

بسنت کی بہار۔ پگڑیاں بسنتی۔ دوپٹے بسنتی۔ تیرا دوپٹہ بھی بسنتی۔ جس کا عکس تیری آنکھوں میں پڑ رہا ہے۔
اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہیں۔
یرقان ہوگیا۔

بسنت کی بہار۔ تیرا دوپٹہ بسنتی۔ رقیب کی پگڑی بھی بسنتی۔
یہ بسنتی جوڑا۔
اسے دیکھ کر میرا رنگ زرد ہوگیا ہے۔
اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجھے
تیری گرمی کی بیماری ہوگئی ہے۔

بسنت کی بہار۔ سرسوں پھول رہی ہے۔ پتنگیں اُڑ رہی ہیں۔ زرد زرد
پتنگیں اور تو ـــــ میری پتنگ۔ سرخ پتنگ۔ وہ کسی نے پیٹیا پیٹیا۔
اور میری پتنگ کاٹی۔ بو کاٹا۔
ڈور۔ تیز مانجھے والی ڈور۔ محبت کی ڈور۔ میری پتنگ کٹی۔
تو ڈور نے میرے ہاتھ کاٹ دیئے۔ دل کاٹ دیا دونو لہو لہان
ہو گئے۔
بسنت کی خونی بہار۔ آہ ہماری بسنت۔

شادی ایجنسی

نئی تہذیب کی جدتوں میں ایک شادی ایجنسی بھی ہے۔ جس کے منیجر یا مالک کو "ڈاڈو خان" کہنا ۔۔ ثواب کا کام ہے۔ کیونکہ یہ بڑے ثواب کا کام کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایجنسی والے عورت اور مرد دونوں سے پیسے بٹور لیتے ہیں لیکن بیچاروں کا کام تو ہو جاتا ہے نہ نائی بھیجنے کی ضرورت نہ میراثی لیں شادی ایجنسی میں گئے۔ فیس ادا کی۔ فارم بھرا اور بے فکر ہو گئے۔ اب ایجنسی کے منیجر صاحب ہیں۔ کہ نائی اور میراثی دونوں کا کام سرانجام دے رہے ہیں اور ور کے لئے کنیا اور کنیا کے لئے ور کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔

بعض ایجنسیاں تو نیک نیتی سے کام کرتی ہیں۔ لیکن بعض ایسی ہیں جو نری چار سو بیس[۴۲۰] ہیں۔ ایک دفعہ ریل میں میری گفتگو ایک دیہاتی سے ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ لاہور کس کام گئے تھے۔؟ دیہاتی بولا میاں جی کچھ نہ پوچھو۔

مجھے شادی کی ضرورت تھی اخبار میں ایک شادی ایجنسی کا اشتہار پڑھ کر میں لاہور گیا۔ اور ایجنسی کا دفتر تلاش کر کے وہاں پہنچا۔ منیجر صاحب نے ایک فارم پر دستخط کرائے اور دس روپے نقد لے لئے۔ نیز یہ کہا کہ ایک ہفتہ کے بعد دو سو روپے لے کر آ جانا۔ ایک رشتہ ہماری نظر میں ہے ہم اس سے بات چیت کریں گے اور امید ہے کہ دو سو روپے میں کام بن جائیگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی خرچ نہ کرنا پڑے گا۔

میں یہ سن کر گاؤں چلا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے بعد دو سو روپیہ لے کر پھر لاہور پہنچا۔ لیکن احتیاطاً (دو مسافروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کے دو رشتہ داروں کو ساتھ لے آیا۔ تاکہ کہیں لٹ نہ جاؤں۔ منیجر نے جب دیکھا کہ میرے ساتھ دو آدمی اور ہیں تو لگے ٹال مٹول کرنے کہنے لگے رشتہ تو ہو جائے گا۔ عورت کے رشتہ دار دو سو روپیہ پر رضامند ہو گئے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ عورت لکھنؤ کے پاس ایک گاؤں میں ہے۔ آپ کو مجھے ساتھ لے کر وہاں جانا ہوگا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ اپنے میرے اور دوستوں کے لکھنؤ تک کے کرایہ سے ڈرا کر مجھے واپس گاؤں بھیجنا چاہتا تھا اور میرے پاس اتنے فالتو پیسے موجود بھی نہ تھے۔ اس لئے میں یہ کہہ کر آ گیا ہوں کہ زیادہ روپے لے آؤں چنانچہ واپس گاؤں جا رہا ہوں اور پھر اس کام کے لئے لاہور نہیں جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے دس روپے گئے۔

شادی کی ایجنسیاں ہمارے ملک میں ہی نہیں۔ بلکہ اور ملکوں

میں بھی ہیں جن دنوں بغداد میں تھا۔ وہاں ایک شادی ایجنسی نیو سٹریٹ میں موجود تھی جس کے منیجر رفعت آفندی تھے اور میرے ایک رفیق کار شوکت آفندی کے بھائی ہونے کے باعث میرے دوست تھے اور ان کے ہاں میرا آنا جانا تھا ایک دن ان کے دفتر میں ایک شخص آیا۔ جو ہائی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ اس نے بیان کیا کہ آفندم! میں شادی شدہ ہوں۔ لیکن میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صرف اولاد کے لئے ایک اور شادی کر لوں۔

رفعت آفندی :۔ بے شک ضرور کرنی چاہیئے۔ بنجر زمین کا کیا فائدہ ہے دفع کروائیے۔

ہیڈ کلرک :۔ ہاں لیکن بنجر زمین کو میں چھوڑ بھی تو نہیں سکتا۔

رفعت آفندی :۔ دفع کر والے میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ اسے چھوڑ دیں میرا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ زرخیز زمین کا ٹکڑا بھی تو ہونا چاہیئے۔ اور ہم آپ کو ایسی بچہ خیز عورت تلاش کر دیں گے کہ جب آپ بازار جائیں تو دو تین بچے آپ کی بیوی نے اٹھائے ہوں اور دو تین آپ کے کندھوں پر چڑھے ہوئے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دام واپس کی شرط ہے۔

معاملہ طے ہو گیا۔ رفعت آفندی نے فارم نکالا۔ ہیڈ کلرک نے اس کی شرط پڑھیں۔ جیب سے ایک دینار نکالا اور فیس کے طور پر ادا کیا۔ اور فارم پر دستخط کر کے چلا گیا۔ رفعت آفندی نے اسے ایک دینار کی رسید دیدی۔

رفعت آفندی نے اسی دن "اخبار استقلال" میں شادی

کی ضرورت کے عنوان سے اشتہار بھیجدیا۔ اور تیسرے دن ایک برقع پوش عورت رفعت آفندی کے دفتر میں آئی۔ اس نے آتے ہی چہرے سے برقع ہٹا دیا۔ اور کہا۔ کہ میرا خاوند مر چکا ہے۔ اور مجھے شادی کی ضرورت ہے۔ رفعت آفندی نے کہا۔ کہ دیکھو بہن آپ جیسی حسین وجمیل عورت کے لئے تو بہت اچھا خوش مزاج خاوند مل سکتا ہے۔ لیکن عورتوں کے معاملہ میں ہم بڑے محتاط ہوتے ہیں آپ اپنے کسی رشتہ دار کو ساتھ لائیں۔ جو آپ کے بیان کی تصدیق کرے۔

خاتون چلی گئی اور دوسرے دن ایک نوجوان کو ساتھ لے کر آئی۔ اور بولی کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس سے بات چیت کر لیجئے۔ رفعت آفندی نے نوجوان سے کچھ "حکمانہ" سوالات کئے اور فارم نکال کر خاتون اور اس کا بھائی دونوں کے دستخط کرا لئے خاتون نے ایک دینار فیس ادا کر دی۔

رفعت آفندی نے اس سے کہا۔ کہ آپ مطمئن رہیئے کام جلد ہو جائے گا خاتون بولی۔ کہ میں اپنے ہونے والے خاوند کو شادی سے پہلے دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ رفعت آفندی نے جواب دیا۔ کہ کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کل ۵ بجے یہاں تشریف لائیں۔

خاتون چلی گئی۔ اور رفعت آفندی نے ہائی کمشنر کے دفتر میں ٹیلیفون کر کے ہیڈ کلرک کو مژدہ سنایا کہ ایک پری چہرہ خاتون ہاتھ آگئی ہے کل چار بجے دفتر سے فارغ ہوتے ہی

میرے دفتر آیئے۔ آپ کو اس کی زیارت کرائی جائے گی۔

ہیڈ کلرک کی رات بیقراری میں گزری "پری چہرہ خاتون" کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اگلے دن آپ بہترین سوٹ پہن کر دفتر گئے۔ لیکن دن دفتر میں اس طرح گذرا۔ گویا قیامت کا دن ہو۔ بار بار گھڑی کو دیکھتے تھے۔ لیکن سوئیوں کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا کہ چار بجنے میں نہ آتے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے چار بجے اور ہیڈ کلرک صاحب نے دفتر سے نکلتے ہی ایک غریبانہ ٹانگہ لیا اور اس سے کہا

"نمبر ۸ انیو سٹریٹ۔"

ٹانگہ رفعت آفندی کے دفتر کے سامنے ٹھہرا اور ہیڈ کلرک صاحب ٹانگہ والے کو کھڑا رہنے کا حکم دے کر اوپر گئے۔

رفعت آفندی نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا کہ آفندم آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ ایسی خوبصورت خاتون آپ نے بہت کم دیکھی ہو گی اور پھر بہت کم عمر۔ اب یہ بتلایئے کہ انعام کیا ملے گا۔

ہیڈ کلرک نے جواب دیا۔ کہ جو آپ کہیں گے اطمینان رکھیئے میں ہر طرح حاضر ہوں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خاتون اندر آئی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اس نے برقعہ کی جالی سے آفندی کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ اور رفعت آفندی نے کہا۔ "کہو بہن یہ شوہر آپ کو پسند ہے۔؟"

خاتون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رفعت آفندی نے کہا۔ گویا آفندی بھی آپ کا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔ خاتون نے کہا "ہرگز نہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے برقع اٹھا دیا۔ اور ہیڈ کلرک صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ یہ اس کی اپنی بیوی تھی۔

اس کے بعد خاتون نے اپنی گرگابی اتار کر اپنے شوہر کی جو "خدمت" اسی جگہ کر دی وہ بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟

بیوی پر شوہر کا راز اس طرح فاش ہوا تھا کہ اس نے شوہر کی جیب میں رفعت آفندی کی دی ہوئی رسید دیکھ لی تھی۔

ماڈرن غزل نمبر ۴

ہر سمت نظر آتی ہے کیا شانِ محبت — یہ ہند کا کالج ہے کہ ایرانِ محبت
چہرہ بھی میرا زرد ہے آنکھیں بھی مری زرد — یا رب یہ ہو دشمن کو بھی یرقانِ محبت
ملتے رہو چھپ چھپ کے مری جان مگر نہ — اخبار میں چھپ جائیگا اعلانِ محبت
دل اور جگر میں ترے مطلب کی دو چیزیں — یہ کلیجۂ الفت ہے تو وہ نانِ محبت
مانگی ہے مرے یار نے کل ریشمی ساڑھی — فرمائشِ جاناں ہے کہ تاوانِ محبت

کابینۂ عالم میں جو بٹنے لگے عہدے
بخشا گیا لُق لُق کو قلمدانِ محبت

ماڈرن غزل نمبر ۵

آبلہ پائی نہ نوکِ خار ہے — دشتِ مجنوں آجکل بازار ہے
نقشِ پا ناقہ کا یکسر مٹ گیا — ماڈرن لیلیٰ کا محمل کار ہے
آنکھ میری دیکھ کر چندھیا گئی — ٹارچ سے بڑھ کر ترا رخسار ہے
ہائے یوں کہنا بُتِ لاہور کا — کھانا حاضر دل بھی تیار ہے
ہے وہ متھرا داس کے زیرِ علاج — آج کل نرگس ذرا بیمار ہے
لوگ اب پستول سے کرتے ہیں قتل — تیرا ابرو آج تک تلوار ہے
میرے نالوں کا انہیں خدشہ نہیں — گویا لُق لُق مرغِ بے منقار ہے

بھلّے کے سینڈل

سخاوت علی تحصیلدار کے لڑکے کی شادی تھی۔ اور ان کے ہاں زنانہ مہمانوں میں گرداور قانون گو رفیق احمد کی بیوی بھی تھی۔ گرداورنی کو عمدہ لباس کا بہت شوق تھا اور یہی باعث تھا کہ جہاں کہیں عورتوں کا اجتماع ہوتا تھا گرداورنی کی سج دھج سب سے نیاری ہوتی تھی اور اگر بقول گرداورنی خدانخواستہ کسی عورت کا کوئی کپڑا گرداورنی کے کپڑوں سے اعلیٰ اور خوشنما ہوتا تھا۔ تو فوراً اس کپڑے کا نام اور بھاؤ پوچھ لیتی تھی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا تھا۔ جب تک وہ اپنے خاوند سے اس کپڑے کی فرمائش کر کے ایسا ہی لباس نہ بنوا لے۔ گرداور بیچارہ فدوی قسم کا خاوند تھا۔ اس لئے بیوی کا حکم اس کے لئے حکم حاکم مرگ مفاجات کی حیثیت رکھتا تھا یا یوں کہیئے کہ بیوی کی فرمائش "کن" کا حکم رکھتی تھی۔ ادھر "کن" کہا اور ہر فرمائش

حاضر۔

تحصیلدارنی کے گھر میں جتنی عورتیں جمع تھیں۔ سب میں گرداورنی کا لباس بڑھیا اور خوبصورت تھا۔ اور تمام عورتیں حسب معمول اس کی طرف رشک کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ لیکن تحصیلدارنی کے جسم پر ایک ایسی چیز تھی جس کے باعث گرداورنی اپنی میزبان کو حسد کی نگاہ سے تک رہی تھی اور اس بات کے لئے بیقرار تھی۔ کہ کب تحصیلدارنی اس کے پاس بیٹھے۔ اور وہ اس سے اس چیز کی قیمت اور ملنے کی جگہ پوچھے۔

بیاہ شادی کے موقعہ پر گھر کی مالکہ کو بہت کم فرصت ہوتی ہے۔ کبھی باہر سے پیغام آیا کہ گھی کا آدھا ٹین اور چاہیئے۔ کبھی نائین نے کہا کہ شیخوں کے گھر کے لئے "بھاجی" تول دیجئے۔ کبھی ضلعدارنی کے استقبال کے لئے ڈیوڑھی تک جانا پڑتا۔ غرض بچاری اس طرح بھاگی بھاگی پھرتی ہے۔ جیسے بیاہ والے گھر میں نائین۔

خدا خدا کر کے تحصیلدارنی کو تھوڑی سی فرصت ملی۔ اور گرداورنی کے پاس آکر بیٹھی گرداورنی نے اس ڈر سے کہ کہیں تحصیلدارنی جلدی نہ اٹھ کھڑی ہو۔ پہلا سوال یہی تھا۔ کہ "بہن یہ سینڈل کتنے میں لئے؟ اور کہاں سے ملتے ہیں۔؟

تحصیلدارنی نے جواب دیا۔ بارہ روپے ہیں۔ یہ بھلے کے سینڈل ہیں انور کے ابا کے ساتھ لاہور گئی تھی۔ تو انارکلی بازار میں بھلے کی دوکان سے خریدے تھے۔

اس گفتگو کے بعد کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے گرداورنی کو دلچسپی ہو وہ اپنے دل میں "بجلہ" اور "انارکلی" کے الفاظ حفظ کر رہی تھی۔ اور اس نے اس وقت تک چین نہ لیا جب تک یہ الفاظ اس کے حافظہ پر نقش نہ ہو گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس شادی کے چند روز بعد گرداور اور گرداورنی کو ایک اور گرداور کے بیٹے کی شادی پر جانا تھا۔ اس لئے سینڈل کی فرمائش کرنا اس کا معاشرتی حق تھا۔ لیکن اگر یہ تقریب نہ بھی ہوتی تو کیا تھا۔؟ اپنے خاوند سے ہر وقت کسی فرمائش کا پورا کرانا گرداورنی کا پیدائشی حق تھا۔

لیکن یہ فرمائش ایسی تھی کہ گرداورنی اس کی خرید میں خاوند کی پسند پر انحصار رکھے خدا جانے گرداور لاہور سے کس قسم کی سینڈل لے آئے؟ سینڈل اسی نمونہ کی چاہیئے جو تحصیلدارنی نے پہن رکھی تھی اور گرداور نے یہ نمونہ دیکھا نہ تھا۔ اس لئے گرداورنی نے حکم دیا کہ لاہور جانے کے لئے تیار ہو جاؤ اور میں بھی ساتھ چلوں گی گرداور صاحب پندرہ دن کی چھٹی پر تو تھے ہی اس لئے چھٹی کا انتظار کرنا نہ پڑا اور فوراً تیار ہو گئے دو نو لاہور پہنچے۔ وہاں پہلے "بجلے کے سینڈل" خریدے اس کے بعد دوسرا سامان۔

شادی کی تاریخ آگئی اور گرداور اور گرداورنی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ گرداورنی زنانہ ڈبہ میں تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینڈل برقعہ کی جھالروں کے نیچے چھپے ہوتے ہیں۔

اور انہیں کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ گرداوری نے برقعہ اتار کر پھینک دیا اور پاؤں کو سامنے کے پھٹے پر رکھ کر جرابیں درست کرنے لگی۔ پھر دوسرے پاؤں کی نمائش بھی کی اس اثنا میں کئی عورتوں کی نظریں اس سینڈل کی چمک دمک کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ لیکن اس سے گرداوری مطمئن نہ ہوئی۔ کیونکہ ڈبہ کے دوسرے سرے کی عورتیں ابھی تک بے خبر تھیں کہ ایک بیگم صاحبہ کے پاؤں میں آس لگ رہی ہے۔

گرداوری نے اپنے سینڈل ڈبے کی ہر عورت کو دکھانے تھے چنانچہ وہ بیت الخلا جانیکے بہانے اٹھی اور خراماں خراماں اسی طرف بڑھی وہ ... نیچی نظروں سے ادہر ادھر دیکھتی اور اپنی تسلی کرتی جاتی تھی کہ سب عورتیں اس کے پاؤں کی طرف تک رہی ہیں۔ بیت الخلا میں گرداوری کو کوئی خاص کام نہ تھا اس لیئے وہ سینڈل اور جرابوں کو ہی درست کرنے لگی۔ دائیں پاؤں کی جراب میں اسے سلوٹ سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے پاؤں سے سینڈل اتارا۔ تاکہ جراب کو کس لے۔ سینڈل کو ایک طرف رکھ کر وہ جراب کس رہی تھی کہ پاؤں سے جھٹک گیا اور سینڈل حاجت خانہ کے راستے ریلوے لائن پر جا پہنچا۔

اب گرداوری حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ کہ سینڈل کا ایک پاؤں لئے ہوئے کس طرح باہر نکلے؟ اور عورتیں کیا کہیں گی۔؟ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن کب تک اندر قید رہتی۔؟ آخر جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی تو گرداوری بیت الخلا سے باہر نکلی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس اسٹیشن سے چند عورتیں ڈبے میں سوار ہو رہی تھیں اور جب عورتیں سوار ہو رہی ہوں اور جگہ

تھوڑی ہو جاتی ہمت آجاتی ہے۔" "اری بہن سمٹ کر تو بیٹھ گز بھر جگہ تیرے بچے نے روک رکھی ہے اسے گود میں بٹھالے تو کیا حرج ہے؟" "دیکھو بہن یہ کیسے اکڑ رہی ہے۔ گویا ریل اسی کے خاوند کی ہے۔" "اماں تو تو اس طرح اڑ رہی ہے۔ جیسے ہم بے ٹکٹ ہیں۔ آخر ہم نے بھی تو کرایہ دیا ہے۔"

غرض اس کھینچا تانی اور چیخم چاخی میں گرداورنی کے پاؤں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکی۔ اور وہ بخیر وعافیت اپنی نشست پہ پہنچ گئی۔ اس نے جھٹ برقع اوڑھا اور اس کے جھالروں میں اپنے پاؤں کو چھپالیا۔ لیکن دل میں سوچ رہی تھی۔ کہ اب کیا ہوگا گھر جانا اور ایک پاؤں ننگے پھر یہ کہ وہاں تک پہنچوں گی کیسے۔؟ یہی باتیں سوچ رہی تھیں۔ کہ وہ اسٹیشن آگیا۔ جہاں اترنا تھا۔ گرداور صاحب ڈبے کے باہر تشریف لائے۔ اور گرداورنی نے گردن کھڑکی سے باہر نکال کر ان کے کان میں کچھ کہا انہوں نے کہا۔ کہ باہر تو نکلو۔

گرداورنی باہر نکلی۔ اور گرداور نے اسے پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بٹھا دیا اتنے میں استقبال کرنے والے بھی آپہنچے انہوں نے کہا۔ کہ باہر تشریف لے چلئے تانگہ حاضر ہے گرداور صاحب بیوی کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ کہ تانگہ تک چلو۔ اگلے گھر پہنچ کر کچھ انتظام کر لیا جائے گا۔ لیکن گرداورنی نے ایسی گھرکی دی کہ گرداور صاحب پسینہ پسینہ ہو گئے اور واپس جا کر میزبانوں سے بولے کہ بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ تھوڑا عرصہ صبر کیجئے ساتھ ہی آپ نے آنکھ بچا کر ایک پٹواری کو جس سے ان کی بے تکلفی تھی۔ دو روپے دیکر کہا کہ دوڑ کر شہر سے ایک جوڑا زنانہ سلیپر لے آؤ۔

آدھ گھنٹہ میں سلیپر آئے اور گرداوری انہیں پہن کر اسٹیشن سے باہر نکلی گرداور صاحب خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ بیچاری کے سوا سلیپروں کا راز کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔

اب بیاہ والے گھر جا کر ایک اور مشکل پیش آئی۔ گرداورنی نے بڑے چاؤ سے سینڈل خریدے تھے۔ اور اس کی خواہش تھی کہ سب مہمان عورتیں اس خوبصورت سینڈل کو دیکھیں لیکن ایک پاؤں کس طرح پہنا جا سکتا تھا۔؟

گرداورنی کے زرخیز دماغ نے ایک ترکیب سوچ لی اس نے ٹرنک کھولکر گرداور کی سفید پگڑی نکالی۔ اس میں سے گز بھر کا ٹکڑا پھاڑ اور اسے دائیں پاؤں پر اس طرح باندھ لیا جیسے پاؤں زخمی ہے۔ پھر بائیں پاؤں میں سینڈل پہن لیا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ عورتیں پوچھتی تھیں کہ بہن پاؤں کو کیا ہوا؟ گرداورنی کا جواب حاضر تھا۔ کہ "موچ آ گئی ہے۔"

گرداور گرداورنی وہاں دو روز رہے لیکن گرداورنی رفع حاجت کے لیئے جانے کے سوا ایک لمحہ کے لئے بھی ایک جگہ سے نہ ہلی۔ کیا کرتی بچاری موچ آ گئی تھی۔

گھر جا کر میاں نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ تم نے بارہ روپے کا نقصان کر دیا۔ تو گرداورنی بولی۔ کہ ہرگز نہیں۔ صرف چھ روپے کا نقصان ہے۔ میاں نے پوچھا۔ وہ کیسے؟ سینڈل تو بارہ روپے میں خریدا تھا۔ گرداورنی نے کہا۔ جب بغلہ کی دوکان میں بیٹھے سینڈل پسند کر رہے تھے تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا تھا کہ لیجئے صاحب اس سینڈل کا دوسرا پاؤں تیار کرا دیجیئے۔ ایک پاؤں گم ہو گیا ہے۔"

ادب کثیف

موسم بہار آگیا۔
ہر طرف گنڈیریاں بک رہی ہیں۔
"آتو چھوٹے گرم" کی صدائیں دل کو لبھا رہی ہیں۔
مداری کہہ رہا ہے۔ "شوم جائیے۔"
ایک طرف سے آواز آئی۔ "چنیل مالش۔"
طانگے والا پکارا۔ "بچ ہو ٹر توں۔" موسم بہار آگیا۔
شاعروں کی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔
کالج میں مشاعرہ۔ انجمن میں مشاعرہ انشورنس کمپنی میں مشاعرہ
شادی پر مشاعرہ۔ چابیسویں پر مشاعرہ۔ موسم بہار آگیا۔
لیکن یہ کیوں آگیا۔ کس نے آرڈر دیا تھا؟ اس کے آنے سے

دل کی رونقیں ختم ہوگئیں۔
وہ حسرتوں کا ہجوم۔ ارمانوں کا لشکر۔ آرزوؤں کا اجتماع۔
موسم بہار آیا۔ تو سب غائب۔
جلسہ برخاست۔ موسم بہار گیا آیا۔ یا نہیں آیا۔

ماڈرن غزل نمبر (۶)

دل چرا کر میرا اے جاناں مجرم اغوا نہ بن
نازنیں نازک بدن ہو کر دغا مرڈرانہ بن

خط کو پڑھتے ہی وہ باندھے ہاتھ آجائیں یہاں
اے میرے مکتوب تھانیدار کا پروانہ بن

اے رقیب تو بھی لبر کی شہ پہ مت اکڑ
اصل پہچان اپنی رانی خاں کا سالا نہ بن

سست رفتاری سے اے دل منزلیں کٹتی نہیں
جادۂ الفت میں موٹر کار بن چھکڑا نہ بن

جوش میں الفت کے گر ہر طرف اودھم مچا
محفل جاناں میں پاگل بنگ ہا پاگل خانہ بن

تو وہی کہتا ہے جو دشمن سکھاتا ہے تجھے
اے صنم کچھ ہوش کر انسان بن طوطا نہ بن

سن کے حرف مدعا عاشق سے اس بت نے کہا
لاج داڑھی کی تو رکھ بابا ہے تو لونڈا نہ بن

ماڈرن غزل نمبر (۷)

یہاں کیوں جمع اے جاں ساری دنیا ہوتی جاتی ہے
تیری محفل بھی تھیٹر کا تماشا ہوتی جاتی ہے

کہوں کیا آج تک پوڈر کی ڈبیا ہوتی جاتی ہے
حسینوں کے لئے جادو کی پڑیا ہوتی جاتی ہے

وہ مجھ کو کھینچتے جاتے ہیں کھنچتا جا رہا ہوں میں
میری ٹائی میری گردن کا رسا ہوتی جاتی ہے

بڑھا کر بال لڑکا آج لڑکی بنتا جاتا ہے
کٹا کر زلف لڑکی آج لڑکا ہوتی جاتی ہے

میرے قلب و جگر کی خیر کیجو اے میرے مولا
نگاہ دیار اکالی دل کا برچھا ہوتی جاتی ہے

رقیب روسیاہ کا ان پر جادو چلتا جاتا ہے
الٰہی کیوں ہماری کھیر دیا ہوتی جاتی ہے

جہاں دیکھا حسیں کوئی وہیں غش کر گئے لق لق
ہماری عاشقی مرگی کا دورہ ہوتی جاتی ہے

جنوں کی شرارت

ہمارے محلے کے امام صاحب جتنے نیک متقی اور پرہیز گار تھے۔ ان کے دو صاحبزادے اتنے ہی آوارہ مزاج اور کھلنڈر واقع ہوئے تھے ان کے ساتھ دو اور لڑکے بھی مل گئے تھے اور سب کا معمول یہ تھا۔ کہ مسجد میں "رام چوک" کھیلا کرتے تھے۔ انہوں نے امام صاحب کے مصلّٰی کے نیچے کوئلے سے لکیریں کھینچ کر "رام چوک" بنا رکھا تھا۔ اور صبح سے ظہر کی نماز سے ذرا پہلے تک یہاں خوب کھیلتے ان کی یہ عادت یہاں تک بڑھی کہ جب نمازی عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے چلے جاتے تو یہ چاروں آدھمکتے۔ اور گل شدہ چراغ کو روشن کرکے اور مسجد کے دقت مسجد میں کسی شخص کے آنے کا خدشہ نہ تھا۔ ان کھلنڈروں نے مسجد کو "بازیچۂ اطفال" بنا رکھا تھا۔ انہیں دکھ تھا تو صرف یہ کہ تیرہ وجہ لاہا نماز عشا کے کچھ عرصہ بعد نفل پڑھنے آیا کرتا تھا اور

ان کے کھیل میں حارج ہوا کرتا تھا. لیکن اس کی نظروں سے بچنا آسان تھا. کیونکہ یہ بیچارا بڈھا آدمی تھا اور دائمی کھانسی کا شکار جب یہ مسجد کی طرف آتا تھا تو دُور ہی سے اس کی کھوں کھوں لڑکوں کو سگنل دیدیتی تھی کہ میں آ رہا ہوں ۔ یہ جھٹ چراغ بجھا کر اِدھر اُدھر چھپ جاتے اور جب نفلوں سے فارغ ہو کر چلا جاتا تو یہ پھر دیا جلا کے کھیلنا شروع کر دیتے ۔

ایک دن بڈھا پیرو مسجد کے باہر تکیہ میں بیٹھا اپنے عہد جوانی کی بہادریوں کے افسانے سنا رہا تھا ۔ اور اتفاق سے چاروں لڑکے بھی بیٹھے سُن رہے تھے ۔ پیرو نے کہا ۔

" بیٹا ! لوگ جنوں کی کہانیاں سنکر دہل جاتے ہیں ۔ اور آج کل کے جوان تو جن کا نام سنتے ہی اپنا وضو توڑ بیٹھتے ہیں ۔ لیکن جن دنوں میں جوان تھا جنوں کی تلاش میں پھرا کرتا تھا ۔ کیونکہ بچپن میں میں ایک جن کا دوست تھا ۔ یہ بات تم نے بھی سُنی ہو گی کہ تمہارے دادا کے پاس ایک جن قرآن شریف پڑھا کرتا تھا ۔ میں بھی اس کا ہم جماعت تھا ۔ یہی تمہارا مکان اس جن کا بنا ہوا ہے ۔ تمہارے دادا مولوی جمال الدین نے ایک دن آہ بھر کر کہا ۔ کہ یہ کیا زندگی ہے ۔ ؟ رہنے کو کشادہ مکان بھی میسر نہیں ۔ میاں اللہ دین (یہ اس جن کا نام تھا) پاس بیٹھے تھے لیکن ہم کیا کر سکتے تھے ۔ ؟ اگلی صبح کو جب گاؤں والے نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ مولوی صاحب کا پرانا مکان غائب ہے اور اس کی جگہ نیا مکان کھڑا ہے ۔ جو بہت کشادہ ہے ۔

اللہ دین کو اس کے بعد کسی نے نہیں دیکھا اور مولوی صاحب تو پہلے

ہم سے جانتے ہوں گے۔ لیکن ہمیں اس دن علم ہوا کہ الہ دین انسان نہیں تھا۔ بلکہ جن تھا۔ وہ قرآن کریم ختم کر چکا تھا۔ اس لئے استاد کی آخری خدمت کر کے غائب ہو گیا۔ مجھے الہ دین سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے راتوں کو گھر سے نکل کر جنگل میں پھرا کرتا تھا۔ تاکہ کہیں الہ دین سے ملاقات ہو جائے۔

ایک رات میں جنگل سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا کہ اسی جگہ جہاں میں اب بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک آدمی سویا ہوا نظر آیا۔ چاندنی رات تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک شخص سفید چادر اوڑھے بیہوش پڑا ہے۔ میں نے شرارت کے طور پر اس کی چادر آہستہ سے اٹھالی اور چل پڑا۔ لیکن چند ہی قدم گیا تھا کہ پیچھے سے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک ہیبتناک چہرہ نظر آیا۔ اس شخص نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ دیکھو۔ اسی مقام پہ واپس آؤ جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ میں وہاں پھر لیٹ جاؤں گا۔ اور تمہیں یہ چادر مجھے اسی طرح اوڑھانی ہو گی جیسے کہ میں اسے اوڑھے ہوئے تھا۔ اگر تم سے یہ نہ ہو سکا تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ مجھے ڈر تو لگا۔ لیکن جوانی دیوانی میں نے کہا چلو۔ چنانچہ یہ شخص اسی جگہ پہ جا کر لیٹ گیا۔ اور میں نے اس پہ چادر ڈال دی۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ چادر جو پہلے اسقدر پوری تھی اب چھوٹی ہے۔ یا تو چادر چھوٹی ہو گئی ہے یا اس شخص کا قد بڑھ گیا ہے۔

اب میں اس کے سر کی طرف چادر کھینچتا تو پاؤں ننگے رہ جاتے اور پاؤں کی طرف چادر کھینچتا تو سر ننگا ہو جاتا۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں۔ آخر میں نے بغل سے ڈنڈا نکال کر اس کی ٹانگوں پر پورے زور سے مارا چوٹ پڑتے ہی

اس نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں، اور میں نے جھٹ چادر میں اس کے پاؤں چھپا کے کہا کہ لو شرط پوری ہو گئی۔ یہ کہہ کر میں چلدیا۔ اور جب میں نے مڑ کر نگاہ کی تو دیکھا کہ یہ شخص جنگل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اور اس کا سر آسمان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔

شام کو جب لڑکوں میں پیرو کی داستانوں پر تبصرہ ہونے لگا تو محمد صادق نے کہا کہ یہ سب من گھڑت کہانیاں ہیں۔ اور میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے۔ جس سے پیرو کی بہادری کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اور ہمیں اس کے نقلوں سے بھی نجات ہو جائے گی۔ ہم کل ہی دیکھ لیں گے کہ وہ جنوں سے ڈرتا ہے یا کہ نہیں۔

اگلے دن محمد صادق نے کچھ سرخ مسالے والی دیا سلائیاں اکٹھی کیں۔ ان کا مسالہ اتارا اور ایک ڈبیہ میں بند کر دیا۔ رات کو جب پیرو کی کھوں کھوں نے اس کے آنے کا الارم کر دیا تو حسب معمول دیا بجھا دیا گیا۔ اور محمد صادق نے ڈبیہ نکال کر دیا سلائیوں کا مسالہ اپنے منہ پر مل لیا۔ چونکہ اس مسالے میں فاسفورس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ رات کے اندھیرے میں شعلوں کی طرح چمکنے لگا۔ جونہی پیرو نے مسجد کے اندر قدم رکھا محمد صادق چمکتے ہوئے اٹھا۔ منہ سے عجیب و غریب غیر انسانی آوازیں نکالتا ہوا پیرو کی طرف بڑھا . . . . . . پیرو اس مصنوعی جن کی ایک گھڑکی کی تاب بھی نہ لا سکا۔ اور ہاتھ میں جوتے سنبھالے گرتا پڑتا باہر کی طرف بھاگا۔ ہانپتا گھر پہنچا۔ تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔ اس نے پوچھا خیر تو ہے۔؟ یہ ہانپ کانپ کیوں رہے ہو؟

پیرو نے جواب دیا کہ ابراہیم کی ماں گیا بتاؤں۔ مسجد میں جن کا بسیرا ہو گیا ہے۔

کئی دن تک لڑکوں کو مزے رہے۔ کیونکہ پیرو نے رات کے وقت مسجد میں آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن مولوی صاحب نے باتوں باتوں میں کہا کہ پیرو نفل پڑھنے جایا کرتے ہو نا؟ پیرو نے جواب دیا کہ نہیں میاں جی آٹھ دس دن سے نہیں گیا۔ اور میں نے ڈر کے مارے آپ کو نہیں بتایا کہ مسجد میں جن رہنے لگا ہے۔ اور جب سے میں نے اسے دیکھا ہے رات کے وقت وہاں جانے کی ہمت نہیں رہی۔

مولوی صاحب نے کہا۔ اچھا۔ آج رات پھر جا کے دیکھیو۔ اگر جن ابھی موجود ہے تو جھٹ مجھے خبر کرنا۔ پیرو نے اس کا وعدہ کر لیا۔ اور رات کو جی کڑا کر کے مسجد کی طرف گیا اس کی کھانسی سُن کر لڑکے سمجھ گئے کہ کمبخت پیرو کا ڈر اتر گیا ہے اور وہ آج پھر آ رہا ہے۔ چنانچہ چراغ بجھا کر دروازہ کھول دیا گیا۔ لیکن جب صادق نے باہر نگاہ دوڑائی تو چاندنی رات میں اسے اپنے ابا جان بھی پیرو کے ساتھ آتے نظر آئے۔ اس نے آہستہ سے ساتھیوں کو کہا۔ بھئی آج پکڑے گئے۔ ابا آ رہے ہیں۔

اب بھاگنے کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لئے کونوں میں دب گئے انہوں نے یہ سوچا کہ جب مولوی صاحب اور پیرو چراغ جلانے کے لئے آگے بڑھیں گے تو ہم نکل بھاگیں گے۔ لیکن مولوی صاحب پہلے ہی بھانپ گئے تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ دروازے میں کھڑے اور پیرو سے کہنے لگے کہ آگے بڑھو اور طاق میں سے دیا سلائی لے کر دیا جلاؤ۔

دیا جلا۔ اور مولوی صاحب نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ چاروں کونوں میں چار شیطان دبکے ہوئے تھے مولوی صاحب نے محراب کی طرف دیکھا۔ تو ان کا مصلّٰی اٹھا کر ایک طرف پھینکا ہوا تھا۔ اور وہاں "رام چوکی" بنا ہوا تھا۔ جس کے خانوں میں کھجور کی گٹھلیاں اور سنگریزے دھرے تھے۔

بس پھر کیا تھا۔ چاروں لڑکوں کی جو گت بنی وہ انہیں ایک عرصہ تک نہ بھولے گی۔ لیکن ایک بات ان کے ہاتھ آ گئی۔ وہ جب پیر سے ملتے تو کہتے کہ کہیئے بابا جنوں سے ڈرتے ہو یا نہیں۔؟

ماڈرن غزل

حاجی لق لق

اُلفت کا کیا مزا ہے؟ اِدھر ہو اُدھر نہ ہو
ہم کو تو دردِ دل ہو اُدھر دردِ سر نہ ہو

یارب کبھی تو دے ہمیں خلوت کا اک پہر
لاری میں میرا اُن کا کوئی ہم سفر نہ ہو

عہدِ جدید میں نئے سامانِ عشق ہیں
کیا لطفِ عشق بازی کا جو فون پہ نہ ہو

میں اُن کے ساتھ بزمِ سینما میں بھی جا کے خوش ہوں
لیکن صنم کی بیٹھے پہ میری نظر نہ ہو

میرا طبیب بولا مرے دوستوں سے کل
چلتا ہوں گر مریض کو دردِ جگر نہ ہو

ہیں اور صنم اکیلے کریں کھل کے بات چیت
ٹیلی وژن ہو اور کوئی نامہ بر نہ ہو

لق لق کا گھر جو دیکھا تو کہنے لگا وہ شوخ
دشمن کو بھی نصیب کوئی ایسا گھر نہ ہو

میری پہلی شرارت

سکول ماسٹر نے طالب علم سے سوال کیا کہ تمہارے شہر میں کون کون سے بڑے آدمی پیدا ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔ جناب کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تو سب بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

یہ لطیفہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہم بھی بچے تھے۔ بچے سے لڑکے بنے لڑکے سے جوان۔ جوان سے بڈھے اور بڈھے سے حاجی لق لق ہوئے بچپن بھی خوب ہوتا ہے۔ ہر وقت شرارتیں ہی سوجھتی ہیں۔ اور دُور کیوں جاؤ۔ یہی تمہارا حاجی لق لق ہی کس سے کم تھا۔

کوئی ملکہ وکٹوریہ کے عہد کا ذکر ہوگا۔ جبکہ ہم چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہمارے مولوی صاحب طلباء کو مار پیٹ کرتے میں ذرا فراخ دل

واقع ہوئے تھے اور مجھ جیسے نالائق شاگردوں نے انہیں اور بھی سنگدل بنا دیا تھا۔ ان کے پاس ایک ڈنڈا تھا۔ مولا بخش نام بہت وزنی اور ٹیڑھا میڑھا۔ مولوی صاحب اس ڈنڈے کو رجسٹروں کے صندوق میں رکھتے تھے۔ اس ڈنڈے کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ اور خصوصاً حساب کے گھنٹے میں تو یہ کمبخت میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میرے تین چار دوست بھی اس سے بہت نالاں تھے۔

ایک دن ہم چار پانچ لڑکوں نے گول میز کانفرنس کر کے اس مسئلہ زمانہ پر بحث کی کہ مولا بخش سے کسی طرح نجات حاصل کی جائے۔ یہ موسم گرما کی تعطیلات کا آخری دن تھا اور اگلے دن ہمیں سکول جانا تھا۔ مولوی صاحب نے ہمیں گھر پر کرنے کے لئے جو کام دے رکھا تھا وہ کانفرنس کے ارکان میں سے کسی نے بھی نہ کیا تھا۔ اور ہم جانتے تھے کہ کل مولا بخش ہوگا اور ہماری کمر۔ چنانچہ تجویز کیا گیا کہ ڈنڈا کو کہیں چھپا دیا جائے۔

اگلے دن سکول کھلا اور میں نے مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ہی صندوق سے ڈنڈا نکال کر اس الماری کے پیچھے چھپا دیا جو اسباق الاشیاء کے نمونوں کے لئے مخصوص تھی۔

مولوی صاحب تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ حساب کی کاپیاں نکالو۔ میں نے کاپی نکالی جو بالکل کوری تھی۔ مولوی صاحب نے کاپی کو دیکھا اور وہی حکم دیا۔ جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی یہ کہ کان پکڑو۔ میرے تین چار دوستوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ساری جماعت کی کاپیاں دیکھنے کے بعد مولوی صاحب صندوق کی طرف بڑھے اور میں نے چور آنکھ سے ان کی طرف دیکھا لیکن اس

دفعہ میرے دل میں کوئی خوف پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ میں نے مولا بخش کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ مولوی صاحب نے صندوق کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن مولا بخش نہ ملا۔ آخر ان کے غضب کا پارہ چڑھ گیا۔ اور انہوں نے لال پیلا ہو ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ بتاؤ مولا بخش کہاں ہے۔ لیکن ہم لوگ تو پہلے ہی کانوں پہ ہاتھ دھرے ہوئے تھے۔

آخر مولوی صاحب صندوق سے ہٹ کر الماری کی طرف بڑھے اور اس زور سے کڑک کر بولے کہ ہمارے دل دہل گئے۔ اور ساتھ ہی مولا بخش الماری کے پیچھے سے باہر آ پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چوہا الماری کو نقب لگا رہا تھا۔ مولوی صاحب کی کڑک سن کر وہ بھاگا۔ اور جاتے جاتے مولا بخش کو بھی جو دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا گرا گیا۔ ہمارا پردہ فاش ہو گیا بس کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ ہم پر وہ ڈنڈا برسا کہ توبہ ہی بھلی۔

چند روز کے بعد ہم نے پھر کانفرنس کی۔ اور اب کے طے پایا کہ مولا بخش کو عدم آباد پہنچا دیا جائے۔ رام سرن نے تجویز کیا کہ اسے سکول کے کنوئیں میں ڈبو دیا جائے یہ تجویز پاس ہو گئی۔ اور اگلے دن میں نے ڈنڈا صندوق سے نکالا۔ اور بڑے آرام کے ساتھ کنوئیں میں پھینک دیا۔

جب ہم جماعت میں پہنچے تو بڑے مطمئن تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ مولوی صاحب کو بھی اس روز ڈنڈے کی ضرورت نہ پڑی۔ لیکن اگلے دن حساب کا گھنٹہ تھا۔ اور ہماری شامت آنا ضروری تھی۔ مولوی صاحب نے جب دو تین سوال لکھائے۔ میرے کان پکڑ دلئے اور مولا بخش کی تلاش کی۔ لیکن صندوق ڈنڈے سے خالی

تھا۔ اب کے تو وہ گالیاں دیتے ہوئے سیدھے میری طرف آئے اور کہنے لگے کہ مولا بخش کے چھپا نیوالے تم ہی ہو۔ بتاؤ ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ میں نے جواب دیا کہ جناب مجھے بالکل خبر نہیں اس پر مولوی صاحب نے مجھے نکھے کے رسّے سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی تین چار ہی رسے پڑے تھے کہ سکول کا سقّہ مولا بخش ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور بولا مولوی صاحب آپ کا ڈنڈا کنوئیں سے نکلا ہے میرے ڈول کے ساتھ اوپر آگیا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا رنگ زرد ہو گیا۔ اور مولوی صاحب کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ انہوں نے گیلے ڈنڈے کو ہاتھ میں لیا اور اسی وقت میری تواضع شروع کر دی۔

رات کو جب میں اپنی چوٹوں کو گرم کئے ہوئے پتھر سے سینک رہا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کم بخت مولا بخش کنوئیں کی تہ سے پانی کی سطح پر کیسے آگیا۔ لیکن یہ معمہ تین سال کے بعد پانچویں جماعت میں جا کر حل ہوا کہ لکڑی اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکی ہوتی ہے۔ اس لئے پانی میں ڈوب نہیں سکتی۔

حاجی لق لق کا اغوا؟

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں مصری شاہ کے کوچے سے گذر رہا تھا شام کا وقت تھا اور گلی سنسان تھی۔ دفعتہً ایک پٹھان کہیں سے آنکلا جس کے کندھے پر ایک بوری تھی۔ اس نے بڑھ کر ایک رومال میری ناک پر رکھ دیا۔ اور میں بیہوش ہو گیا۔ اس کے بعد یہی ہوا ہوگا کہ پٹھان نے مجھے بوری میں ڈال کر اس کا منھ بند کر دیا ہوگا۔ اور آپ لفٹ سوسائٹی مصری شاہ بن کر مجھے اپنے کندھے پر اٹھا لیا ہوگا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بوری میں بند ہوں میں نے جنبش کی تو پٹھان نے آہستہ سے کہا۔ دیکھو۔ اگر بولے تو ہم خنجر مار کر تم کو قتل کر دے گا۔ سن لیا۔ چند لمحوں کے بعد پٹھان نے بوری کا منہ کھول کر مجھے باہر نکالا۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی پٹھان خنجر تانے کھڑا تھا۔ اس

نے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر میرا کیا بنے گا لیکن خنجر کے خوف سے چپکا ہو رہا۔ سامنے ریلوے اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔ جس کے سائین بورڈ پہ دہاڑی لکھا تھا۔ سڑکوں کے چوک میں سڑک نما نصب تھا۔ جس کے ایک طرف لکھا تھا لڈن کو۔ لڈن خان بہادر نواب احمد یار خان دولتانہ کا گاؤں ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ اے کاش کہیں نواب صاحب اس طرف آنکلیں تو کم از کم اسمبلی میں تو میرا ذکر آجائے۔

پٹھان نے بوری لپیٹ کر بغل میں دبالی اور مجھے پھر قتل کی دھمکی دیکر ایک دوکان پر لے گیا۔ جہاں مجھے کچھ کھلا پلا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں ایک لاری آئی۔ جس کا ڈرائیور بچا رہا تھا۔ آؤ کوئی بوڑھے والہ۔ ٹبہ۔ مخدوم رشید۔ ملتان۔ دنیا بھر" پٹھان مجھے لے کر لاری میں سوار ہو گیا۔ اور لاری ملتان کی طرف روانہ ہوئی جب ہم مخدوم رشید تھانہ کے سامنے پہنچے تو ایک باوردی پولیس کا کانسٹبل سواریوں کی پڑتال کرنے آیا۔ میں نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر شور مچا دیا کہ یہ پٹھان مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ کانسٹبل نے پٹھان کو اور مجھے لاری سے اتار لیا۔ اور ہمیں تھانے کے اندر لے گیا تھانیدار نے ہم سے چند سوال کرنے کے بعد پٹھان کو حوالات میں بند کر دیا اور نام اور پتہ لکھ کر کہا جاؤ۔ اور کل اسی وقت حاضر ہونا۔ میں تھانے سے نکل کر یونہی ایک طرف کو چل دیا۔

میں راستہ میں سوچتا جا رہا تھا کہ پٹھان نے مجھے اغوا کیوں کیا چند سال سے میری عینکیں اغوا ہو رہی ہیں۔ لطیف برادرز نے مجھے تین چار عینکیں دیں۔ سب کی سب اغوا کر لی گئیں۔ پھر رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس

نے ایک عینک دی وہ بھی غائب ہوگئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ایک اور عینک بخشی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ کب تک اغوا سے بچی رہے گی۔ ان عینکوں میں سے ایک کے متعلق پتہ چلا تھا کہ اسے ایک پٹھان نے اغوا کر کے فقیر صاحب اپی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ شاید وہ پٹھان ہی ہو جو مجھے اغوا کر کے لے جا رہا تھا لیکن کہاں لے جا رہا تھا؟ فقیر اپی صاحب کے پاس گیا فقیر صاحب کوئی اخبار نکالنے والے ہیں۔

میں اسی خیال میں چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک گاؤں نظر آیا میں نے ایک کسان سے پوچھا کہ اس گاؤں کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا۔ جلال آباد۔ میں گاؤں میں پہنچا جہاں بہت سے زمیندار گھنے درختوں کی چھاؤں میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ حقہ کا دور چل رہا تھا۔ انہوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر میں بیسیوں آدمی جمع ہوگئے۔ اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

ایک بڈھے آدمی نے کہا۔ بھائی تم شہری آدمی ہو۔
ہمیں شہر کے متعلق کچھ بتاؤ۔
میں نے کہا۔

شہر اور دیہات ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں دونوں میں انسان ہی بستے ہیں۔ لیکن تمدن کے معیار میں فرق ہے۔ شہر گناہوں کی بستیاں ہیں وہاں سنیما ہیں ہوٹل ہیں عشرت کدے ہیں اخباروں کے دفتر ہیں ملائی کی کلفی والے ہیں شہر دوزخ کا ایندھن ہے۔ وہاں مصیبت برستی ہے۔

دیہات معصومیت کے گہوارے ہیں۔ یہاں سادگی ہے۔ امن و سلامتی

ہے۔ محبت دردمداری ہے کھلی ہوا میں خوشگوار پانی ہے تکتے ہیں۔ حقے ہیں دیہات جنت کا سرمایہ ہیں یہاں رحمت برستی ہے ایک نوجوان نے کہا بھائی ہمیں کچھ محکمہ نہر کے متعلق بتاؤ۔ ہماری کھیتیاں سوکھ رہی ہیں مویشی بھوکے مر رہے ہیں ماسٹر ٹائے پور میں پانی کافی نہیں آتا کئی درخواستیں حکام کو بھیجی ہیں لیکن ہماری فریاد کوئی نہیں سنتا۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم کیا کریں۔

میں نے کہا۔

سارا گاؤں بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جائے۔ اور خدا سے مطالبہ کرو کہ بارش بھیجے کئی آوازیں آئیں" بھوک ہڑتال کیا ہوتی ہے۔؟"

میں نے بھوک ہڑتال کا مطلب سمجھایا۔ اس پر گاؤں کا چودھری بولا بھوک سے تو ہم پہلے ہی تنگ آگئے ہیں۔ اور اگر اب کے فصلوں کو پانی نہ ملا تو ہماری بھوک ہڑتال خودبخود ہو جائے گی۔

گاؤں کا امام مسجد بولا۔ آپ نے بھوک ہڑتال کا جو مطلب سمجھایا ہے یہ تو خودکشی ہے۔ جو اسلام میں حرام ہے۔

چوکیدار بولا" اور تھانیدار بھی خودکشی کرنیوالے کو گرفتار کر لیتا ہے۔"

میں نے کہا۔

اگر بھوک ہڑتال نہیں کر سکتے تو چندہ جمع کرو اور ایک بادل خرید لو جب چاہا بارش برسالی۔ محکمہ نہر سے بھی جان چھوٹے گی۔'

نمبردار بولا۔ ہم میں چندے کی طاقت کہاں۔ یہاں تو کوئی شخص بیمار

ہو جائے تو شربت نیلوفر کے لئے پیسہ نہیں ملتا۔

میں نے کہا۔

یہ نہیں تو درختوں کی شاخیں کاٹ کاٹ کے ایک نیزہ بناؤ جو آسمان تک پہنچ سکے۔ گاؤں کے لوہار کو کہو کہ وہ نیزے کے لئے تیز پھل بنا دے یہ نیزہ بڑا کار آمد ہو گا جب چاہا آسمان میں سوراخ کر کے بارش برسالی گاؤں کا درزی بولا۔ لیکن بارش بند کرانی ہو گی تو آسمان میں پیوند کون لگائے گا۔

میں نے کہا۔

تمہیں قینچی اور سوئی دھاگا دیکر نیزے کے سرے سے باندھ دیا جائیگا۔ جب بارش ہو چکے تو تم پیوند لگا دیا کرو۔" اس پر قہقہے بلند ہوئے۔

ایک شخص بولا۔ کہ ہمیں کچھ مویشیوں کے متعلق بتاؤ۔ ہم تو روپیٹ کر اپنا گذارہ چلا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے مویشی کیا کھائیں چارہ میسر نہیں ہوتا کھیتیاں جل رہی ہیں۔ بتاؤ ہم کیا کریں۔

میں نے کہا۔

تم لوگوں نے مویشیوں کا کھڑاگ خواہ مخواہ لگا رکھا ہے مشینیں منگاؤ پٹرول سے چلنے والے ہل خریدو۔ کنوئیں پر موٹریں لگاؤ۔ آج کل مشینوں کا زمانہ ہے مویشیوں کو ہٹاؤ۔

نمبردار بولا۔ لیکن مشینیں خریدنے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے۔

میں نے کہا۔ "قرض اٹھاؤ۔"

ساہوکار بولا۔ "اچھی تجویز ہے۔"

میں نے کہا۔

ہاں میرے بھائیو۔ اگر قرض نہ ملے تو روپیہ کو اغوا کر لو۔"

ممبرِ وادر نے کہا ہمارے محسن تم نے ہمیں بہت کچھ بتایا اب آرام کرو۔"

ٹھگی

میسرز چھبلال پکوڑی لال جواہریوں کی دوکان کے سامنے ایک موٹر ٹیکسی آکر ٹھہری اور اس میں سے ایک برقع پوش خاتون نکل کر دوکان کی طرف بڑھی۔ ان دنوں مسلمان خاتون کا بازار میں نظر آنا دنیا کا آٹھواں عجوبہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ انجمن ہدایت خواتین کے علاوہ مسلمان مردوں کی انجمنوں نے بھی اپنی اپنی مصروفیتوں کو اس کوشش پر مرکوز رکھا کہ عورتیں خرید و فروخت کرنے کیلئے بازار میں نہ نکلیں اس کوشش کا یہاں تک اثر ہوا کہ سینما زدہ خواتین بھی ایسے سینماؤں میں جانے لگیں جو کسی بازار میں واقع نہ ہوں۔

مذکورہ بالا فرم کے بڑے حصہ دار لالہ چھبلال ابھی ابھی اپنے ملازم دمعاولن کپوری مند سے گفتگو کر رہے تھے کہ بھئی یہ مسلمان بھی عجیب قوم ہے۔ یہ لوگ ہر چیز کو مذہبی رنگ دے لیتے ہیں۔ اور ذرا ذرا سی بات پر "اسلام خطرہ میں" کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ عورتوں کے بازار آکر خود سودا سلف خریدنے میں انہیں کونسی بات قابل اعتراض نظر آتی ہے۔ کپڑے اور زیور کے معاملہ میں عورت کو صرف اپنی ہی پسند مطمئن کر سکتی ہے۔ اور اسے مردوں کے سودا خریدنے سے یقیناً گھر گھر میں روز لڑائی جھگڑے ہوتے ہوں گے۔"

چھبلال کی یہ آخری بات درست تھی۔ کیونکہ اس کا خود بھی یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ ابھی گذشتہ ہفتے حکم ہوا تھا کہ دو قمیصوں کے لئے ریشمی کپڑا لا دو ہم نے جو زیادہ

نکلتے دیکھے تو سوچا یہ اسراف بیجا کب تک ہمارے چولہے کو گرم رکھ سکے گا۔ ہم نے انجمنوں کی تحریکات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور بازار سے چھ گز سوتی کپڑا لے آئے گھر والوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آپ سے تو ریشمی کپڑے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہم نے اخبار نویسانہ شان سے کہا تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ فلسطین میں بڑے زور شور سے جنگ ہو رہی ہے۔ اس لئے جاپان نے ہندوستان میں ریشمی کپڑا بھیجنا بند کر دیا ہے۔ جواب ملا کہ ابھی کل ایک پھیری والا ریشمی کپڑے کی صدا دے رہا تھا لیکن میں اس وقت مشغول تھی۔ اس لئے کپڑا نہ خرید سکی۔ ہم نے کہا۔ "اری احمق وہ حبش کے کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا ہے۔ جن پر اب اطالیہ کا قبضہ ہے اور جانتی نہیں ہو کہ اطالیہ نے اس حبشہ پر جبراً قبضہ کر لیا ہے۔" جس کے بادشاہ نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجرین اسلام کو پناہ دی تھی کیا موذی اطالیہ کے کارخانوں کا مال خرید کر کافر بننا چاہتی ہو۔؟"

ہمارے معلومات کا اثر تو کافی پڑا لیکن آپ عورتوں کے مزاج سے واقف ہی ہوں گے۔ جب بات سوتی کپڑے کی کوالٹی اور نرخ پر پہنچی تو تو معاملہ بگڑ گیا۔ اور دونوں طرف سے ایسی ایسی گوہر افشانیاں ہوئیں کہ سارے محلے نے دلچسپی لی

لالہ بھولا مل نے کچوری تندہی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ ذرا اس بات پر تو غور کرو کہ اگر عورتیں کپڑے کی دوکان پر نہ جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ کیونکہ پھیری والے پارچہ فروش "خالی بوتل" والوں کی طرح گلی گلی میں پھر جاتے ہیں۔ اور عورتوں کو گھر بیٹھے ہر قسم کا کپڑا خریدنے کا موقعہ مل جاتا ہے لیکن مرد بیوپار خریدنے آتا ہے۔ اور کان پھول کو اپنے کان میں لٹکا کر اور مونچھوں کو ہاتھ سے چھپا کر آئینہ

میں دیکھتا ہے۔ کہ زیور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یا نہیں!"

کچوری نند نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ لالہ جی اس مشکل کا حل یہ ہے کہ آپ مجھے ایک ٹوکرے میں چند زیور رکھ دیا کیجئے۔ اور میں روزانہ گلی کوچوں میں صدائیں دیتا پھروں گا کہ لے لو تازہ زیور۔"

اب لالہ بھلا مل نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا کہ ہمارے کام میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارا مال قیمتی بہت ہوتا ہے۔ اور ہم ہر کس و ناکس کو کوئی چیز دے نہیں سکتے کہ گھر جا کر پسند کر لائے۔

بھلامل نے جملہ ختم کیا ہی تھا کہ مذکورہ بالا خاتون نے سیڑھیاں چڑھ کر دوکان کے اندر قدم رکھا۔ اور سیدھی شیشے کی الماریوں کی طرف بڑھی۔ جن میں سونے چاندی کے خوشنما زیور چمک رہے تھے۔ لالہ بھلامل بھی پیچھے پیچھے ہو لیا اور جب خاتون دستی کی الماری کے سامنے ٹھہر گئی تو لالہ جی بھی اس کے عین مقابل ہو کر بولے حکم فرمایئے کیا چاہیئے۔؟

خاتون نے جو موٹر سے لے کر دوکان کے دروازہ تک اس کوشش میں مصروف نظر آتی تھی۔ کہ اس کی انگلی تک بھی برقع سے باہر نظر نہ آئے۔ اب بے باکانہ طور سے نقاب الٹ دی۔ ادھر اس کی نگاہ دیں زیور کی چمک دمک سے چکاچوند ہو گئی اور ادھر لالہ جی کی آنکھیں خاتون کا چندے ماہتاب حسن دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ لالہ جی نے کچھ تو اپنے زیوروں کو زیادہ نمایاں کرنے کے لئے اور کچھ پری زاد خریدار کے جمال کا لطف اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا کر بجلی کی بتیاں روشن کر دیں۔ خاتون ایک خاص عشوہ طرازی کے ساتھ بولی۔ لالہ جی جڑاؤ کنگنے دکھایئے

لالہ جی نے جھٹ الماری کھولی اور بیش قیمت کانٹوں کی جوڑی جو خوبصورت مخملی ڈبیہ میں دھری تھی نکال کر سامنے رکھ دی خاتون نے ایک ایک کو اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور قیمت دریافت کرنے کے بعد الگ اور زیور دکھانے کو کہا۔ وہ بھی حاضر کیا گیا۔ پھر تیسرا پھر چوتھا۔ پھر پانچواں۔

خاتون پسندیدہ زیورات کو ایک طرف رکھتی گئی۔ اور لالہ جی سوچنے لگے کہ آج صبح کس بھاگوان کا منہ دیکھا تھا۔

خاتون کے کہنے پر لالہ جی نے تمام زیوروں کی قیمت کا میزان کیا سو تین ہزار روپے بنے۔ اور لالہ جی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ منتظر تھے کہ خاتون برقعے کے اندر سے بٹوا نکالے گی اور سو سو روپے کے نوٹ گن کر لالہ جی کے ہاتھ میں دے دے گی۔ لیکن اس خاتون نے مسکرا کر کہا۔ لالہ جی یہ زیور مجھے تو بہت پسند ہیں۔ لیکن بہتر ہو کہ ڈاکٹر صاحب بھی دیکھ لیں۔ میں ڈاکٹر رمضان خان کی بیوی ہوں۔ اور وہ آج بہت مصروف ہیں۔ اس لئے اگر آپ اپنا آدمی میرے ساتھ بھیج دیں تو پسند ہو گئے پر روپے اسے دے دیئے جائیں گے۔

لالہ جی نے ذرا تامل کیا۔ لیکن خاتون نے ایک عجیب معشوقانہ انداز سے لالہ جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔ گھبرانے کی بات نہیں میں کوئی انجان نہیں ہوں۔ ایک مشہور ڈاکٹر کی بیوی ہوں

ڈاکٹر رمضان خان شہر کے ہر دلعزیز اور بہت قابل ڈاکٹر تھے پریکٹس کا یہ حال تھا کہ انہیں سینکڑوں روپے روزانہ کی آمدن تھی۔ اس لئے ان کی بیوی کا ایک ہی دفعہ دس ہزار روپے کے زیورات خرید لینا بھی عجیب بات نہ تھی۔ لالہ جلال نے کچھو دی نند کو آواز دی اور کہا کہ بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ۔ اور جو زیور پسند آئیں ان کی قیمت لے آؤ۔ یہ کہہ کر لالہ جی نے اپنے ملازم کو ہر ایک زیور کی قیمت بتا دی اور کچھو دی نند نے

کھونٹی سے پگڑی اتار کر سر پر رکھ لی جسے دیکھ کر خاتون کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ کچوری نند پشاوری کلاہ پر لنگی باندھتا تھا اور پگڑی کے ساتھ عجیب سا نظر آتا تھا۔

(۲)

ڈاکٹر رمضان خان کے مطب کے سامنے موٹر کار آ کر ٹھہری اور خاتون زیور لیے نیچے اتری۔ اس نے کچوری نند سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بلائیں گے تو اندر آنا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچوری نند کو ڈاکٹر صاحب کے ملازم نے اندر بلایا اور ڈاکٹر صاحب نے اسے کرسی پر بٹھا کر اس کے چہرے اور آنکھوں کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر کہا "زبان نکالو"۔ کچوری نند حیران ہو کر بولا۔ ڈاکٹر صاحب میں مریض تو نہیں۔ آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ میں تو زیور والا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے زیور کا نام سن کر قہقہہ لگایا اور کہا بس ٹھیک ہے تمہیں یہی بیماری لاحق ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اس کے دل کی حرکت دیکھنی شروع کر دی۔ کچوری نند چیخ کر بولا۔ اجی ڈاکٹر صاحب آپ کیا کر رہے ہیں۔ زیور دلوں کی بات کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو ملازموں سے کہا۔ اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دو۔

نوکروں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ اور اسے کھینچنا شروع کیا کچوری چلانے لگا۔ یہ کیا کر رہے ہو۔

کیا زیور ہضم کرنے کا ارادہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے نوکروں سے مخاطب ہو کر کہا" پروا نہ کرو۔ لٹا دو اس بیچارے کو عجیب مرض لاحق ہو گیا ہے۔ خفقان کی قسم سے اس کی بیوی کہتی ہے کہ ہر وقت زیور کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔

کچوری نند گھبرایا "میری بیوی۔؟" میری بیوی کہاں ہے۔؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا گھبراؤ نہیں ساتھ والے کمرے میں ہے۔ اس کے سامنے تمہارا مرض زیادہ زور پکڑتا ہے۔ اس لئے اس کی تجویز پر میں نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا ہے۔ شور نہ

مچاؤ۔ صبر سے کام لو۔ تمہارا مرض انشاء اللہ جاتا رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ لگانے کی ایک سوئی نکالی۔

اتبو مجوری نند بہت پریشان ہوا۔ وہ بولا " ڈاکٹر صاحب میں تو زیورات کے دام لینے آیا ہوں۔ میں ایشور کی کرپا سے تندرست ہوں۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔؟

پیرس کی ہولی

آپ جانتے ہیں کہ "قلمی پچکاری" سے ہمارا کیا مطلب ہے یعنی کہ گویا فونٹین پن۔ جسے فیروز شاہ تغلق کے زمانے کے گریجویٹ "انڈی پینڈنٹ" کہا کرتے تھے۔ اور ہمارے اسحاق کاتب "انڈی پن" لکھتے ہیں۔

ہم اپنے تمام مضامین خواہ قلمی ہوں یا غیر قلمی، علمی ہوں یا بے علمی۔ تاریخی ہوں یا جغرافی۔ الجبری ہوں یا اقلیدسی ہمیشہ یعنی بارہ مہینے پنسل سے لکھنے کے عادی ملزم ہیں۔ کیونکہ قلم دوات سے لکھنے والوں کی میز پہ "سرخ سیاہی" اور سیاہ سیاہی کے دھبوں سے جو ہولی کا منظر نظر آتا ہے وہ بعض شخص کو ایک آنکھ نہ بھاتا ہوگا! اور ہمیں خدا کے فضل اور سرمہ متنوی لبصر کی مہربانی سے دونوں آنکھ نہیں بھاتا۔ لیکن اس مضمون کے متعلق ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ضرور فونٹین پن سے لکھا جائے گا۔ کیونکہ آخر ہمارے بزرگ جو رسوم کی پابندیاں عاید کر گئے کوئی ہم سے زیادہ بیوقوف تو نہ تھے اور وہ صاف لکھ گئے ہیں کہ ہولی کے دن پچکاری کا استعمال ضروری ہے لکھ دیا نا تو درکنار یوں کہیئے کر گا بھی گئے ہیں۔

کنھیا رے سے کھیلو ہوری

سب سکھیاں مل بن بن آئیں!! کوئی سانولی کوئی گوری!
اپنے اپنے منڈل سے نکلیں ساس نانند سے چوری!
رنگ گلال اڑائیں مل کر خوب چلے پچکاری!

میں تجھ کو تو مجھ کو رنگے   تو میرا میں توری!

کنہیا مو سے کھیلو ہوری

یہ سند ہمارے لیے کافی تھی۔ اسی لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ ہولی کا مضمون فونٹین پین سے لکھا جائے۔ جو پچکاری کے مشابہ ہو بلکہ یوں سمجھئے کہ پچکاری ہی کی ایک قسم ہے۔ ہمارے پاس فونٹین پن موجود نہ تھا۔ لیکن ہم نے نیت کرلی کہ خواہ کسی دوست کا فونٹین پن چرانا ہی کیوں نہ پڑے لکھیں گے "پچکاری" سے۔ نیت نیک تھی۔ اور نیک نیتی کا نتیجہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کرنا خدا کا ایسا ہوا۔ کہ ہمارے دوست "غیر معروف جرنلسٹ" نے امریکہ کے نئے اخبار کا پتہ نوٹ کرکے اپنا فونٹین پن ہماری میز پر غیر ارادی طور پر رکھ دیا۔ اور ہم نے آنکھ بچا کر اس پر ایک ایسا اخبار دھر دیا جسے ہمارے دوست پڑھ چکے تھے اس کے بعد ہم نے ایک سنسنی خیز موضوع پر گفتگو شروع کردی تاکہ جرنلسٹ صاحب کو قلم یاد نہ آجائے ہمارا "نسخہ" تیر بہدف ثابت ہوا اور غیر معروف جرنلسٹ اپنا فونٹین پن وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

جب فونٹین پن مل گیا تو ہم نے موضوع تلاش کرنا شروع کیا۔ لاہور اور امرتسر کی ہولی پر فونٹین آزمائی کو دل نہ چاہا جس میں بعض ہندو رنگ کے علاوہ ایک دوسرے پر کیچڑ اور گندگی بھی پھینکتے ہیں۔ اس تصور سے طبیعت ایسی پریشان ہوئی کہ گویا ہم لاہور کا کوئی اخبار پڑھ رہے ہیں۔

دفعتہً ہمیں ہولی کے دن کی ایک لطیف مجلس یاد آگئی۔ جس میں ایک "جنس لطیف" جنت رنگ ساڑھی پہنے اپنی چشم مست کے سرخ ڈوروں کے ساتھ حاضرین کی حریص تمناؤں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھی۔ اس کی ہر آنکھ ایک پچکاری تھی جس سے رنگ کی بجائے تیر نکلتے تھے یا حاجی لق لق کا فونٹین پن تھا۔ جو ہولی پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اور رنگینیاں پیدا کر رہا تھا۔

یہ خاتون کوئی "مسماۃ" نہیں تھی۔ بلکہ ایک میم تھی۔ جو ہمارے سکھ دوست مسٹر جگجیت سنگھ کی بیوی یعنی وائف تھی۔ اور یہ واقعہ بھی ہندوستان کا نہیں بلکہ پیرس کا ہے جہاں جنگ کے سلسلہ میں بہت سے ہندوستانی موجود تھے "پارس" کے ہولی نمبر کیلئے دفعۃً پیرس کا ایک واقعہ یاد آجانا ایک عجیب بات ہے کیونکہ اگرچہ پارس اور پیرس میں پورب پچھم کا فرق ہے لیکن ہندوستان اور انگلستان کے سوا باقی تمام مشرقی اور مغربی ممالک میں پیرس کو پارس ہی کہا جاتا ہے بہرحال کوئی صاحب اقلیدس کے اصول موضوعہ کے حساب سے یہ فرض نہ کرلیں کہ پیرس سے ہمارا مطلب پارس "یا دفتر "پارس" ہے۔

ہولی کا دن تھا۔ اور اس تقریب پر پیرس کے ایک مشہور ہندوستانی جوہری لالہ نے تقریباً پچاس ہندوستانیوں کی ضیافت کی تھی۔ ہولی کی رعایت سے میزوں پر ہفت رنگ میز پوش بچھائے گئے تھے اور ہر گلدستہ مختلف رنگ کے پھولوں سے بنایا گیا تھا۔ گلاس برتن تھالیاں حتیٰ کہ کھانے اور مٹھائیاں بھی رنگین تھیں۔ کچھ مختلف رنگوں کی بوتلیں بھی دھری تھیں۔ خدا جانے ان میں کیا تھا۔ کہتے تھے کہ شراب ہے۔ اس لئے ہم نے ان کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

کھانے پینے کے بعد لطیفہ بازیاں شروع ہوئیں۔ اور ہر طرف قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ لیکن مسز سنگھ نے حسب عادت اپنا ہینڈ بیگ کھولا پوڈر کی ڈبیہ۔ لپ سٹک (لبوں پر ملنے کی سرخی) اور آئینہ نکال کر میز پر رکھا اور چہرہ تیز کرنے میں مشغول ہوگئیں مسز سنگھ یہ بناؤ سنگار ریلوے ٹرین میں پلیٹ فارم پر۔ ٹرام میں غرض ہر جگہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ شروع کردینے کی عادی تھی۔ اور ہم اسے کئی دفعہ ٹوک چکے تھے۔ لیکن اس دفعہ ہمیں ایک نئی شرارت سوجھی۔

جب میم صاحبہ اپنے لب و رخسار کی آرائش سے فارغ ہوگئیں۔ تو ہم نے ہاتھ بڑھا کر یہ سارا سامان اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اپنے چہرے پر پوڈر جھاڑنے لگے۔ ہمارے پاس کے آدمیوں نے قہقہہ لگایا۔ اور سب اہل مجلس جھک جھک کر بڑھ بڑھ

کر اور اٹھ اٹھ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کمرہ قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ مسز سنگھ بھی ہنس رہی تھی۔ لیکن مسٹر سنگھ کا چہرہ جوش غضب سے لال پیلا ہو کر ہولی کھیل رہا تھا۔ آخر وہ نہ رہ سکا اور گرج کر بولا یہ کیا حماقت ہے عورت ذات کی ہتک کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔؟"

ہم نے پوڈر لیف ڈبیہ کے اندر رکھ دیا اور جواب دیا۔ کہ کیوں جی۔ عورت ذات کو ہماری ہتک کرتے حیا نہیں آتی۔؟ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ کی عورت پوڈر ملے تو فیشن ہے اور ہم یہی کام کریں تو اس کی ہتک ہوتی ہے۔ ذرا ہمیں اس فلسفے کا مطلب تو سمجھایئے۔

مسٹر سنگھ سے کوئی جواب تو بن نہ سکا۔ بگڑ کر بولے۔ "پوڈر ملنے سے خوبصورت بن جاؤ گے؟ ہزار پوڈر ملو۔ کوئی یورپین لڑکی تم سے شادی کرنے سے رہی میں جانتا ہوں تمہیں جس بات کا حسد ہے۔"

مسٹر سنگھ کا اشارہ اس امر کی طرف تھا۔ کہ گویا ہم ان کی خوبصورت بیوی دیکھ کر حسد کرتے ہیں ہمیں حیرت ہوئی کہ ایک معمولی مذاق پر اتنا بگڑنا اور بات کو بھری مجلس میں اتنی دُور لے جانا مسٹر سنگھ سے کیونکر ہو سکا۔؟ لیکن ہماری حیرت ایک لمحہ میں کافور ہو گئی۔ کیونکہ ہم نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تو پورے بارہ بجے تھے۔؟

صاحب خانہ نے یہ بے لطفی دیکھ کر فوراً ایک تقریر شروع کر دی جس میں پارٹی کا باقی پروگرام بتایا۔ آپ نے کہا کہ "اب ہولی کی ایک قدیم رسم ادا کی جائے گی اس کے بعد میرے ایک دوست آپ کو شعبدے دکھائیں گے۔ اور پھر......

یہ ہولی کی رسم کیا ہے۔ جو ادا کی جائے گی۔ ہم ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے اور اس کا جواب ہمیں جلد مل گیا۔ لالہ صاحب کے اشارے پر چند ملازم ہاتھوں میں پچکاریاں لئے مختلف دروازوں سے نکلے اور قبل اس کے کہ ہم سنبھل سکیں سُرخ

رنگ کے پانی کی دھاروں نے ہمارے کپڑوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ اکثر مہمانوں کے سوٹ سفید تھے۔ جن پر سرخ رنگ بہت کھلا اور وہ صوبہ سرحد کے سرخپوش یا روس کے بالشویک نظر آنے لگے۔

ہم سب صاحب خانہ کی اس بے تکلفی اور حماقت پر بڑے برہم ہوئے ہم حیران تھے۔ کہ اب بازار میں کیونکر نکلیں گے لالہ جی کی مہمان نوازی اجازت نہ دیتی تھی کہ ہم ان سے بدتمیزی کے لئے بازپرس کریں۔ ہم حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے کہ ایک طرف سے شعبدہ باز حضرت اٹھے اور انہوں نے شعبدے دکھلانے شروع کر دیئے یہ شعبدے ایسے عجیب و دلچسپ تھے کہ ہمیں کپڑوں کی "ستیاناسی" بالکل فراموش ہو گئی اور جادوگر کی حرکات و سکنات میں محو ہو گئے۔ یہ سلسلہ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد شعبدہ باز دفعتاً بولا۔ ایک دو تین! وہ دیکھئے آپ کے کپڑوں کا رنگ اڑ گیا۔ ہم نے فوراً اپنے اپنے لباس کی طرف دیکھا اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رنگ کا نشان تک موجود نہ تھا۔

صاحب خانہ نے اپنی آخری تقریر میں مہمانوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ جو رنگ ہم پر پھینکا گیا تھا۔ وہ ایک کیمیاوی مرکب تھا۔ جو چند منٹ کے بعد خود بخود اڑ جاتا ہے اور رنگ کا نشان باقی نہیں رہتا۔

جنگ جو قومیں

پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کہتے ہیں کہ جنگ جو قومیں صرف پنجاب میں آباد ہیں۔ اس لئے افواج میں ہندوستانی عنصر زیادہ کرنے کی ہر سکیم میں پنجابیوں کا سابقہ تناسب قائم رکھا جائے۔

بھائی! یہ سکندر حیات خاں ٹھہرے۔ وزیر اعظم اور ہم معمولی ہزل نویس وزیر اعظم کو کون سمجھائے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی تیس مار خاں بستے ہیں اور وزیروں کو سمجھا بھی کون سکتا ہے۔ دانا کہہ گئے ہیں کہ جورو اپنے شوہر کی وزیر ہوتی ہے اور ہمیں اس سے بالکل اتفاق ہے کیونکہ ہم نے اگلے دن اپنے وزیر کو بہترا سمجھایا کہ دیکھو ننھے کی ماں ریشمی کپڑا پہننے سے اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن ہمارے وزیر صاحب نے ہماری ایک نہ مانی اور ایک عدد ریشمی رومال خرید ہی لیا۔ جب ہم غریبوں کے وزراء کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کی نہیں سنتے تو حکومت کے وزیر بھلا کب کسی کی سنتے ہیں اور ہماری تو کون سنتا ہے جن کو چپڑاسی کا مرتبہ بھی حاصل نہیں بہر حال بزرگوں کا قول ہے کہ بھولے ہوئے کو رستہ دکھانے سے چار نفلوں کا ثواب ہوتا ہے اس لئے ہم اپنے صوبے کے وزیر اعظم کی خدمت میں عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ حضور والا پنجاب کے باہر بھی جنگ جو قومیں آباد ہیں۔ اور حاجی لق لق نے اسی میدان جنگ میں ان کے کارنامے دیکھے ہیں جن کا حال آپ بارہا دیگر پنجابیوں کو رستم کی اولاد ظاہر کرتے ہیں۔

اگر آپ کو تجربہ نہ ہوا ہو تو حاجی لق لق کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیے اور سنئے کہ ہندوستان میں کیسے کیسے جنگ جو لوگ آباد ہیں۔ اول نسیم اللہ یو پی کے باشندے

کو لیجئے ہمارے پنجابی بھائی انہیں پوربیوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور لاہور کے شاعر تو یو۔پی کے شاعروں کو بھی "پوربئے" کہتے ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ انہیں حقارت کے ساتھ پوربئے کہنا درست نہیں یہ صحیح ہے کہ وہ پنجاب سے پورب کی سمت بستے ہیں اور اور اس لحاظ سے انہیں پوربئے کہنا غلط نہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو وہ پورب۔ پچھم اتر دکھن ہر جگہ بستے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کی فوجی قابلیتوں سے انکار کرے۔ تو وہ سکندر گروہ۔

فوج میں پنجابی لوگ تو وہی اچھے سپاہی کہلائے جا سکتے ہیں جو ان پڑھ ہوں دشمن کی فوجیں دیکھ کر منطقی دلائل سوچنے نہ لگ جائیں لیکن پوربئے ان پڑھ ہوں یا پڑھے ہوئے دونوں اعلیٰ درجہ کے سپاہی ثابت ہوئے ہیں اور تاریخ پورب مصنفہ پروفیسر رام دین اس حقیقت پر گواہ ہے۔ بہرحال ہم دونوں کی قابلیتیں وزیر اعظم پنجاب کی اطلاع کے لئے ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے پڑھے لکھے پوربیوں کو لے لیجئے ان میں قریباً ہر ایک شاعر ہوتا ہے اور تمام شعرائے ہند کے دیوان گواہ ہیں کہ شاعر نہ تیر سے ڈرتا ہے نہ تفنگ سے کیونکہ اسے ہر روز ان ہی ہتھیاروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے ہر کوچہ میدان جنگ ہوتا ہے۔ وہ گھر سے نکلتا ہے تو جدھر جاتا ہے نگاہوں کے تیر چتونوں کے بھالے تبسم کی بجلیاں اور اداؤں کے برچھے اس کے دل پر برسنے شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ بہادر سینہ تان کر ان تمام کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ سہ

جگہ کس کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے قاتل
کٹاری کو چھری کو بھانپ کو خنجر کو پیکاں کو!

ان حالات میں اس سے زیادہ مفید سپاہی کون ہو سکتا ہے جس پر اسلحہ کی بوچھاڑ ہو۔ اور ذرا بھر پرواہ نہ کرے؟

شاعر میں ایک اور خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر روز مرتا ہے لیکن پھر جی اٹھتا ہے۔

اور اگر خدانخواستہ کبھی مر کے جی نہ سکے تو قبر ہی میں پڑا وہ سارے کام کرتا ہے جو زندگی میں کیا کرتا تھا۔ اور وہیں سے ترنم کے ساتھ شعر عرض کرتا ہے۔

سنبھل سنبھل کے قدم رکھ زمیں پہ اے ظالم
شہید ناز کا تیرے مزار راہ میں ہے

اس سے ظاہر ہے کہ اگر فوج میں شاعر بھرتی کئے جائیں تو فوج کی نفری کبھی کم نہیں ہو سکتی اور پھر ان پر اسلحہ کا اثر نہیں ہو سکتا اس صورت میں وزیر اعظم صاحب ہی فرمائیں کہ جب خواندہ یو۔ پی کے ۹۹ فیصدی شاعر ہوتے ہیں تو ان سے بڑھ کر فوجی خدمات انجام دینے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

گھبرائیے نہیں ذرا اور سنئیے یہ نہ سمجھئے کہ پوربیا شاعروں کی فوجی قابلتیں ختم ہو گئیں۔ وزیر اعظم تو خواہ مخواہ صوبائی تعصب سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ ان "اہل زبان" حضرات کی فوجی استعداد بے اندازہ ہے۔

ہم نے گذشتہ جنگ عظیم میں ایک لکھنوی سپاہی کو دیکھا۔ وہ اپنے کیمپ میں تو شعر و سخن کا ہنگامہ اکثر گرم رکھتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ اس کے کلام نے وہ کام کیا کہ ۱۱۲ پنجاب رجمنٹ بھی نہ کر سکی۔

رات کا وقت تھا اور انگریزی سپاہ آرام کر رہی تھی کہ یکا یک جرمن فوج نے حملہ کر دیا۔ کیمپ میں بھاگڑ مچ گئی سپاہی ہراساں و پریشاں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے کیونکہ حملہ ایسی عجلت کے ساتھ ہوا کہ ہمارے سپاہی اپنے ہتھیار تک نہ سنبھال سکے۔

کیمپ میدان قیامت بن رہا تھا کہ یکا یک ہمارے لکھنوی سپاہی نے جو "سانوریا" تخلص کرتا تھا۔ بڑے زور کی آواز سے کہا حضرت جرمن مطلع عرض ہے شاعر نے مطلع پھر مطلع ثانی پھر مطلع ثالث عرض کیا۔ لیکن کچھ اثر نہ

ہوا۔ آخر جب وہ پانچویں چھٹے شعر پر پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ دشمن کے فائر کم ہو گئے ہیں۔ شاعر کے لئے یہ کافی داد تھی۔ اسے لئے اس نے ایک غزل تو کیا سہ غزلہ ختم کر ڈالا ہمارے سپاہیوں نے جب آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ جرمن فوج بیہوش پڑی ہے حضرت سانوریا نے فاتحانہ لہجہ میں حکم دیا اٹھو اور چھین لو ان کمبختوں کے ہتھیار چنانچہ ہتھیار چھین کر جرمن سپاہیوں کو انہیں کی پگڑیوں سے جکڑ دیا گیا۔ اور جب تک انہوں نے شاعری میں سانوریا صاحب کی شاگردی اختیار کرنے کی قسم نہ کھالی ان کے بند نہ کھولے گئے یاد رہے کہ یہ جرمنوں کی وہی پلٹن تھی۔ جس نے ایک دن پہلے نمبر ۱۱۲ پنجاب رجمنٹ کو شکست دی تھی۔ اور یہ حضرت سانوریا وہی ہیں جنہیں قیصر ولیم نے ملک الشعرائے کا خطاب دیکر اپنے دربار میں بلا لیا تھا۔ اور ان کے قصیدہ پڑھنے پر انگریز اسیروں کو رہا کر دیا تھا۔

جنگ عظیم کا ایک اور واقعہ بھی سُن لیجئے۔ اگرچہ وہ ہمارے لکھنوی سپاہیوں کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن قابل معافی ہے واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک لکھنوی پلٹن جرمن سپاہ کے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی۔ جب دونوں لشکر صف آرا ہوئے اور انگریز کمان افسر نے لکھنوی پلٹن کو فائر کا حکم دیا تو ایک سپاہی نے دوسرے سے کہا۔ اجی آپ پہلے دوسرے نے تیسرے سے کہا۔ اجی آپ پہلے۔ اسی طرح یہ اجی آپ پہلے کی گردان چلتی گئی حتیٰ کہ جرمنوں نے ایک ہی بوچھاڑ کر ان کا صفایا کر دیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قصور لکھنوی سپاہیوں کا نہیں تھا۔ بلکہ رجمنٹل ملا کا تھا جس نے رات کو کیمپ کے اندر وعظ کرتے ہوئے ایک غزوہ نبوی کا حال سنایا تھا جس میں متعدد مجاہدین اسلام زخمی ہوئے تھے۔ اور ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص ایک زخمی کے پاس پینے کا پانی لایا تو اس نے ساتھ والے زخمی سے کہا تم پہلے پیو اسی طرح جب مجروحین ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے گئے۔ اور سبھی سب

شہید ہو گئے۔

بہر حال لکھنوی سپاہیوں نے بھی شہیدی مرتبہ حاصل کر لیا۔ اور ان کا یہ فعل بھی بہادری سے خالی نہیں۔

ہم جنگ میں رہے ہیں۔ اور ہم نے وہاں جو جو کچھ دیکھا ہے انہیں کہاں تک بیان کیا جائے۔ بہر حال اب ذرا یہ بھی سنیئے کہ ان پڑھ پوربیئے فوج کے لئے کس قدر مفید ہیں۔

ان پڑھ پوربیئے سائیس کا کام ایسا کر سکتے ہیں کہ شاید دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ اسی لئے تو وہ کہا کرتے ہیں کہ سائیس علم دریاؤ ہے۔ اس میں ایک سو بیس نسوائے لگتے ہیں۔"

فوج میں سائیسوں کی بے حد ضرورت ہوتی ہے پھر وہاں دھوبی سائیس گھسیا دوں کے بغیر بھی کام نہیں چل سکتا۔ اور گرمیوں کے دنوں میں فوجی کیمپ میں ملائی کی برف بھی بکنی چاہیئے یہ سارے کام پوربیوں کے لئے مخصوص ہیں اس لئے اگر فوج میں ان کاموں کی ضرورت پڑتی ہے اور یقیناً پڑتی ہے تو پھر وزیر اعظم پنجاب کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان فوجی قابلیتوں کے ماہر فوجی اعزاز کے حق دار نہیں۔ اور پھر خوبی یہ ہے کہ سرکاری راشن بھی ان کے لئے بہت کم چاہیئے۔ صرف بھنے ہوئے چنے یا ستو کافی ہیں۔

ان حالات میں وزیر اعظم پنجاب کو اپنے مطالبہ پر نظر ثانی کرنی چاہیئے اور ضرورت ہو تو حاجی لق لق سے مشورہ لینا چاہیئے۔

ادب کثیف

گوہر شاخسار کی کیف پرور اشک ریزیوں میں غنچہ عمیق کی تبسم شکن تاریکیوں میں
موج آبجو کی خار افشاں گہرائیوں میں فضائے ناقہ کی آبرو ریز معصومیوں میں
لباسِ شب خوابی میں کرائے کی موٹر میں

آسان قسطوں میں۔ پیا آن بسو مورے من میں دل دھڑکتا ہے۔
روٹی کے ساتھ پانی پینے کو جی چاہتا ہے۔ رات کو بجلی کے بغیر پڑھا نہیں جاتا۔
بولتے وقت زبان ہلتی ہے۔ روتے وقت آنسو نکل آتے ہیں چلتے وقت آنکھیں
کھلی رہتی ہیں۔ آہ! حسن کا آزار۔ پیا آن بسو مورے من میں۔

میری آہوں سے ڈرو۔ ستیہ گرہ سے خوف کھاؤ۔ بھوک ہڑتال کروں گا۔ اگر
میری بات نہ مانو گے تو پھر سول نافرمانی کر دوں گا۔ معافی مانگ کے پھر آجاؤں گا

"ورنہ پیا آن بسو مورے من میں۔
واہ میری مرلی۔

کیا ہلکی بنی ہے۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہے۔
تاکہ وقت پہ مدرسے پہنچ جائے۔ ہاں سنا دے۔۔۔۔ پریم کی دھن گا دے
سبودھ کنگ۔

پیا آن بسو مورے من میں۔

ماڈرن گیت

پیا آن بسو مورے من میں

ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ   سات آٹھ نو دس گیارہ بارہ

ہیں بارہ عدد درجن میں

پیا آن بسو مورے من میں

بجے گی ... دریا کے کنارے   بگوگو سے آلو بخارے۔ آرے آرے

ہے موج تمہری لندن میں

پیا آن بسو مورے من میں

تیرے بنا میں تڑپ رہا ہوں   کون ہوں میں بتلاؤ کیا ہوں؟

بارود نہیں ہے گن میں

پیا آن بسو مورے من میں

پیاری پیاری صورت تیری   فوٹو تیرا مورت تیری

تیرے بنا ہوں کل سے بھوکا

تمری نہیں سالن میں

پیا آن بسو مورے من میں

انتخابات، اسمبلی اور فلم

ملک میں انتخابات کی آندھی بڑے زور سے چل رہی ہے ہر گلی کوچے سے ہر قسم کے امیدوار کھڑے ہو گئے ہیں اور اہل ملک کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ اگر اعانت و عنایت سے ہم کامیاب ہو گئے تو پھر دیکھنا ہم تمہارے لئے کیا کیا نہیں کرتے ہر امیدوار اپنے لئے زبردست پروپیگنڈہ کر رہا ہے اور ووٹروں کی زیادہ سے زیادہ کے دل میں گھر کر کے کامیاب ہونا چاہتا ہے۔

اس جنگ میں زمیندار، ساہوکار، قانون دان، رئیس، جاگیردار، تاجر، مولوی، لیڈر، اخبار نویس، مقرر غرض ہر قسم کے لوگ بطور امیدوار شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن کتنی غضب کی بات ہے کہ سب سے زیادہ دلچسپ اور ہر دلعزیز تمدنیاتی یعنی دنیائے فلم میں اس کے متعلق کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ لوگ منتظر ہیں۔ کہ اگر لاہور سے کوئی سینما ہال کا مالک امیدوار اسمبلی بنے تو یار لوگوں کو کم از کم دو چار فلمیں تو ٹکٹ کے بغیر دیکھنی نصیب ہو جائیں۔ اور اگر کوئی فلم ایکٹرس ہی کھڑی ہو تو اس کا

"زندہ ناچ گانا" مفت دیکھنے کا موقعہ ہاتھ لگے۔ نیز عجب نہیں کہ گھر بیٹھے بیٹھے دیدار ہمکلامی نصیب ہو جائے۔ کیونکہ آج کل امیدواران اسمبلی لوگوں کے گھروں میں جا جا کر خیر و عافیت پوچھتے ہیں۔ اور مفلسوں کی امداد تک بھی کرتے ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ لاہور کے مالکان سینما کیوں اب تک خاموش ہیں۔ اور صوبہ کی مجلس قانون ساز میں کس لئے دیائے سینما کی نمائندگی کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ اسمبلی میں جا کر خود اپنی برادری کے لئے بڑے بڑے مفید قوانین بنوا سکتے ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ وہ اسمبلی میں جا کر ایک مسودہ قانون پیش کر کے منظور کرا سکتے ہیں کہ کوئی اخبار کسی فلم کے خلاف رائے زنی کر کے فلمی ترقیوں کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے۔

۲۔ چونکہ فلم کا مقصد رفاہ عام ہے۔ اس لئے اس اشتہاروں کے لئے کوئی اخبار نویس معاوضہ نہ مانگے۔ اور سب فلمی اشتہارات مفت چھپیں۔

۳۔ برہنہ رقص ممنوع نہ ہو۔ کیونکہ اس سے ریاضت بدنی اور جسم کی نشو و نما کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

۴۔ فلموں پر سے سنسر اٹھا لیا جائے کیونکہ پبلک کو ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانا بہت بڑی خدمت خلق ہے۔ اور سنسر بورڈ اس میں حارج ہوتا ہے۔

۵۔ یہ کوخواہ وہ ٹوٹی ہوئی ہو یا ثابت اس امر کا اختیار نہ ہو کہ وہ سینما والوں کے طریق نشر و اشاعت یعنی باجہ اور جلوس کے ساتھ اشتہاروں کی تقسیم وغیرہ میں مداخلت کرے۔ اس کے جواز کی دلیل یہ دیجا سکتی ہے کہ آخر یہ خوانچہ والے جو "گلاب والی ریوڑیاں" اور "گرم آلو چھولے" کا شور مچاتے پھرتے ہیں۔ اور "بمبئی والی کلفی" بیچنے والے تین چار چار کی تعداد میں ایک آواز ہو کر "کلفی کا نغمہ" گاتے ہیں۔ اور پھر تانگے والے جو "چلو بھئی ہیرا منڈی" پکار پکار

کر لوگوں کا دماغ چاٹ لیتے ہیں۔ کیوں منع نہیں کیا جاتا وغیرہ۔

غرض سینما والوں کے لئے اس قدر نئے قوانین کی ضرورت ہے کہ اگر وہ سارے قوانین منظور ہو جائیں۔ تو ان کی جلد سازی تعزیرات ہند کے مجلد سے بھی بڑھ جائے ان حالات میں ہمیں تو افسوس ہی ہوتا ہے کہ سینماؤں کے مالک کیوں اس فرض سے غافل ہیں۔؟ مانا کہ ممبری میں کامیاب ہونے کے لئے روپیے کی ضرورت ہے لیکن سینماؤں کے مالکوں کے آگے یہ کوئی بڑی مشکل نہیں سارے اخراجات کے لئے ایک دو شاندار ہفتے کافی ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت ہمیں اس بات پر ہے کہ فلم ایکٹروں کی طرف سے کیوں اس معاملہ کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ حالانکہ جہاں وہ بادشاہوں کا پارٹ ادا کر سکتے ہیں وہاں اسمبلی کے ممبر کا پارٹ کرنا ان کے لئے کوئی مشکل چیز نہیں فلموں کے اندر انہوں نے کئی دفعہ بادشاہوں اور مہاراجوں کے وزیر بن کر نئے نئے قوانین وضع کئے ہوں گے اور داد قانون دی ہو گی۔ لیکن تعجب ہے۔ کہ وہ اپنی اصلی زندگی میں یہ فرض ادا کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ حالانکہ مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے ایک مشہور مقدمہ کے دوران میں مجسٹریٹ سے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ "میاں تم سے تو ایکٹر لوگ مجسٹریٹی کا پارٹ عمدہ طور پر ادا کر سکتے ہیں۔"

پچھلے دنوں سنا تھا کہ کوئی ہندوستانی ایکٹر دینائے فلم کی طرف سے امیدوار اسمبلی کھڑے ہو رہے ہیں۔ اور کامیاب ہونے پر وہ اسمبلی میں عمدہ تعلیمی فلمیں ہونے کے متعلق تحریکات پیش کریں گے۔ لیکن ابھی تک صوبہ میں ان کی کامیابی کے متعلق کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کھڑے ہونے کے متعلق جو ارادہ ظاہر کیا تھا وہ محض کسی فلم کا ایک ٹکڑا تھا۔ بہر حال اگر ہمارا یہ نظریہ غلط ہے۔ اور صاحب موصوف فی الحقیقت انتخابات کے میدان

نمائندے چنے۔ تو ہم لوگوں سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ انہیں کامیاب بنائیں۔ اور ممبر صاحب سے ہماری استدعا ہے کہ اسمبلی میں جا کر فلموں کے متعلق ایسی اصلاحات منظور کرا دیں۔ جن کے ماتحت "ستیاجی" کی تلائی پر سٹ واچ بندھی ہوئی نہ ہو۔ "کرشن جی" کے بال انگریزی وضع پر کٹے ہوئے نہ ہوں۔ کوئی "بیوی" اپنے خاوند کی لاش پر کھڑی ہو کر بھیرویں کی ٹھمری کے ذریعے نالہ و بکار نہ کرے۔

ہمیں یہاں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک رات کسی سینما ہال میں ہمارے قریب کی نشستوں پر ایک شریف خاندان کے زن و مرد بیٹھے تھے۔ پردہ سیمیں پر جب عاشق و معشوق نے بوس و کنار شروع کر دیا تو شریف خاتون نے اپنی نوجوان بیٹی سے کہا۔ کہ منہ پیچھے کی طرف موڑ لو۔ لڑکی بیچاری نے حکم کی تعمیل کی۔ اور چند لمحوں کے بعد بولی بھابھی! کیا وہ سین ختم ہو گیا۔ یا نہیں۔ میں منہ سامنے کر لوں۔؟"

بہر حال ہم ان امیدوار صاحب سے اگر وہ اسمبلی کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں۔ گذارش کریں گے کہ وہ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھیں۔

اب رہا ایکٹرسوں کا معاملہ سنا ہے کہ کسی دوسرے صوبے میں ایک فلم ایکٹرس میدان انتخاب میں اتر آئی ہیں لیکن تعجب ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کے لئے اخبارات میں کسی فلم ایکٹرس کی "امیدواری" کا ذکر دیکھنے میں نہیں آتا۔ حالانکہ ان کی کامیابی بہت سہل ہے وہ مردوں کے ووٹ بلا طلب حاصل کر سکتی ہیں اور عورتوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے صرف یہ وعدہ کرنا کافی ہو گا۔ کہ اگر میں تمہاری مدد سے کامیاب ہو گئی تو اپنے حسن و خوبصورتی کا راز کسی معاوضہ کے بغیر ظاہر کر دوں گی اور یہ بھی بتا دوں گی۔

کہ نظر فریب میک اپ کس طرح کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں دلفریب ایکٹ موشن بھی مفت سکھا دوں گی۔

اس وعدہ کے ساتھ فلم ایکٹرس عورتوں کے بے شمار ووٹ حاصل کر سکتی ہے
ہے کوئی اللہ کی بندی جو آئے میدان میں

فلمی زاویئے

نئے زمانے کی ترقیات میں فلم ایک ایسی چیز ہے جسے پرانے خیالات کے ملّاؤں کے سوا دنیا کے سب بچے بوڑھے مرد عورت اور مخنّث پسند کرتے ہیں اس لحاظ سے یہ دنیا کی مقبول ترین ایجاد ہے ہم نے ایسے اشخاص کو بھی دیکھا ہے کہ وہ سینما دیکھنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب انہیں کہیں سے مفت کا پاس ہاتھ آگیا۔ تو سینما کے دروازے پر پہنچے اور ادھر اُدھر دیکھ کر بچ بچا کر منیجر کے کمرہ میں گھس گئے۔ اور وہاں سے سینما ہال کے اندر جا دھمکے۔

سینما گھروں میں فلم کو ہزاروں اشخاص روزانہ دیکھتے ہیں لیکن آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے۔ کہ مختلف اشخاص ان چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصاویر کو مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

آؤ ہم بتائیں کہ ایک فلم کو کن کن نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

مالک فلم کا نقطۂ نگاہ

فلم کے مالک کا ایک نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جوں جوں فلم بنتا جاتا ہے مالک کی ایک نگاہ کے ساتھ نقطے بڑھتے جاتے ہیں اور جب فلم مکمل ہو جاتا ہے تو اس کی ایک نگاہ کے ساتھ چھ سات نقطے لگ جاتے ہیں اور وہ فلم کی بجائے روپے دیکھنے لگتا ہے۔

ہندوستان کا مالک فلم اور کباڑیہ ایک ہی ذہنیت کے آدمی ہوتے ہیں جس طرح کباڑیہ ایک آنہ کی چیز کو جھاڑ پونچھ کر اور پالش وغیرہ کر کے ایک روپے میں بیچنا چاہتا ہے۔ اسی طرح فلم کے مالک کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک فلم پر چار پانچ ہزار روپیہ خرچ کر کے لاکھوں روپے کمائے وہ کباڑیوں سے سامان خریدتا ہے اور اسے فلم میں استعمال کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ اب ہُن برسیں گے لوگ اس کی فلم کو تفریح کے طور پر دیکھتے ہیں ... لیکن وہ اپنی فلم کو اس نظر سے دیکھتا ہے جیسے رالی برادرس کا مالک ہندوستان کے گیہوں کے فصل کو بعض اوقات اس فصل کو کیڑا لگ جاتا ہے۔ یعنی فلم فیل ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات وارے کے نیارے ہو جاتے ہیں۔ بہر حال فلم کا مالک جب اپنے فلم کی طرف دیکھتا ہے تو بظاہر اس کی آنکھیں پردہ فلم پر لگی ہوتی ہیں۔ لیکن باطنی آنکھوں سے وہ پبلک کی جیبوں کا جائزہ لیتا ہے۔

ڈائریکٹر کا نقطۂ نگاہ

ڈائریکٹر کے کیا کہنے۔ اس کی نظر میں فلم پریوں کا اکھاڑہ ہے اور وہ

خود راجہ اندر ہر روز نئی نئی پریاں اس اکھاڑے میں بار پانے کے لئے آتی ہیں۔ اور اکثر اوقات ابتدائی "امتحان" ہی کی تاب نہ لاکر واپس چلی جاتی ہیں۔ بعض بڑی "زمانہ ساز" ہوتی ہیں۔ وہ آخری امتحان تک ثابت قدم رہتی ہیں۔ اور اکھاڑے میں شامل کر لی جاتی ہیں۔ پرانی پریاں تو گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہیں۔ اور ڈائریکٹر ان میں سے ہر ایک کو اپنے "شیدا" رکھنے کے لئے ایک ترکیب جانتا ہے اور وہ ترکیب ہیروئن کا پارٹ دینے کا وعدہ ہے فلمی دنیا کا یہ "بلیو برڈ" ہر شام ایک ایکٹرس سے اسے ہیروئن بنانے کا وعدہ کرتا ہے اور صبح کو بھول جاتا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ڈائریکٹر عیش و عشرت کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا۔ جب وہ کسی ایکٹرس سے شادی کر لیتا ہے تو بہت محنت کرتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو ایکٹرس سے مکمل ایکٹرس اور مکمل ایکٹرس سے مکمل تر ایکٹرس اور مکمل تر ایکٹرس سے مکمل ترین ایکٹرس بنا دیتا ہے۔

بہر حال اس کے عام نقطۂ نگاہ کی ہم نے وضاحت کر دی ہے۔

ایکٹر کا نقطۂ نگاہ

ایکٹر کی نظر میں فلم کی ملازمت انسانی زندگی کی ترقیوں کی انتہا ہے۔ وہ پری وش ایکٹرسوں کی صحبت میں دن رات رہ کر تاک جھانک کا عادی ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے ڈائریکٹر کے "پس خوردہ" پر ہاتھ صاف کرنے کا فخر بھی حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ فلمی زندگی سے فلم کے باہر کی مجلسوں میں فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی پارٹیوں میں جائے جہاں عورتیں بھی

ہوں۔ اور کوئی شخص وہاں یہ کہہ دے کہ "یہ فلاں مشہور ایکٹر ہیں۔" وہ ایکٹر ہی کے رعب سے غیر فلمی عورتوں اور لڑکیوں کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے۔ کہ وہ جس بازار سے گذرے انگلیاں اٹھیں۔

ایکٹر کے نقطۂ نظر سے فلم کی ملازمت کسی حرم سرا کی دربانی ہے۔ جہاں کبھی کبھی قسمت لڑ بھی جاتی ہے۔

ایکٹرس کا نقطۂ نگاہ

ایکٹرس کے لئے فلم اس کے حسن کا صیغۂ اشتہارات ہے یا یوں کہیئے۔ کہ ایکٹرس کی نگاہ میں فلم وہ آلہ ہے۔ جس کے ذریعہ سونے کی کانیں دریافت ہوتی ہیں اس کا کسی فلم میں ایک دفعہ ظاہر ہونا اس کے ہزاروں عاشق پیدا کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ایکٹرس کے نقطۂ نگاہ سے فلم عاشق پیدا کرنے کی مشین ہے۔

فلمی زندگی میں ایکٹرس کو کسی ایک آدھ "مفت خورے" عاشق ہی سے پالا پڑتا ہے۔ جو کبھی ڈائریکٹر ہوتا ہے کبھی مالک اور کبھی دونوں اس کے سوائے ایکٹرس کی ہر مرغی "سونے کے انڈے دینے والی ہوتی ہے اس لئے فلم کے متعلق ایکٹرس کا نقطۂ نگاہ مالک کے نقطۂ نگاہ سے بھی زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ کیونکہ مالک کو فلم کے فیل ہو جانے کی صورت میں خسارے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ لیکن ایکٹرس کے ہاں ہمیشہ پو بارے۔

کالجیٹ کا نقطۂ نگاہ

کالج کا لڑکا فلم کو ایک جنت خیال کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ابلیس وہ

جانتا ہے کہ ابلیس کو جانے کا حکم نہیں۔ لیکن پھر بھی بار بار کوشش کرتا ہے کہ گناہوں کی معافی مل جائے اور جنت میں جانا نصیب ہو وہ گھر سے روپے چراتا ہے اور بمبئی یا کلکتے جاکر نگار خانوں کا طواف کرتا ہے۔ جب روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ تو واپس آجاتا ہے۔

وہ جب پردہ فلم پر کسی ایکٹرس سے بغلگیر ہوتا دیکھتا ہے۔ ایک آہ بھرتا ہے۔ اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ "اے کاش یہ ایکٹرس ہوتا۔" اس کا نقطہ نگاہ محض فریب نگاہ ہوتا ہے۔

نوجوان لڑکیوں کا نقطۂ نگاہ

یہ نقطۂ نگاہ بہت خطرناک ہے۔ نوجوان لڑکیاں عموماً فلم کو محبت کی درسگاہ سمجھتی ہیں وہ فلم سے عشق کا سبق سیکھتی ہیں اور پردہ فلم پر۔۔۔۔ جب عاشق معشوق راز و نیاز کی باتیں کرتے بغل گیر ہوتے اور بوس و کنار کا شغل فرماتے ہیں۔ تو نوجوان لڑکیاں ان کے ایکٹ موشن کو پورے غور سے دیکھتی ہیں اور ان تمام باتوں کو اپنے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ خود اس پر عمل کر سکیں اور عموماً دوسرے ہی روز وہ ایسے حالات پیدا کر لیتی ہیں۔ جن سے انہیں رات کا سبق عملی طور پر دہرانے کا موقع مل سکے۔ لاہور میں ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں کہ رات کو لڑکی نے سینما دیکھا اور اگلے روز یا چند روز کے بعد غائب۔ ہم اس لئے اس مضمون کے پڑھنے سننے والوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ نوجوان لڑکیوں کو سینما کا راستہ نہ دکھائیں۔ ورنہ ان لڑکیوں کا نقطۂ نگاہ ناموس پر بدنما دھبہ بن کر رہ جائے گا۔

ایڈیٹر کا نقطۂ نگاہ

ایڈیٹر لوگ سینما بہت دیکھتے ہیں کیونکہ انہیں مفت کا پاس مل جاتا ہے۔ لاہور کے سینماؤں میں بعض اوقات ایڈیٹر دوسری پبلک سے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔

کسی فلم کے متعلق ایڈیٹر کا اپنا نقطۂ نگاہ کوئی نہیں۔ فلم دیکھتے وقت اس کی نظر اپنے اخبار کے مفاد پر ہوتی ہے۔ اگر اس فلم کا اشتہار اخبار کے لیئے مل چکا ہے تو ایڈیٹر کی نظر میں فلم دنیا کی بہترین فلم ہے۔ اس کے تمام عیوب و نقائص خوبیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اگلے دن وہ اپنے اخبار میں فلم کی تعریف میں ایک شاندار ریویو لکھتا ہے۔ لیکن اگر اشتہار نہیں ملا۔ تو فلم کا ڈائرکشن خراب سٹینگ نکما۔ ایکٹنگ بھدا۔ مکالمہ بے ربط۔ موسیقی ناقابل برداشت۔ فوٹوگرافی ردی پلاٹ ناکارہ غرض یہ کہ تمام فلم ایک دم جلا دینے کے قابل بلکہ بعض دفعہ یہ بھی کہ "اس سے مذہبی طور پر دل آزاری ہوتی ہے۔"

بہرحال ایڈیٹروں کا نقطۂ نگاہ صرف ایک نقطہ ہوتا ہے یعنی صفر!

حاجی لق لق کا نقطۂ نگاہ

حاجی لق لق کے نقطۂ نگاہ سے فلم بڑی اچھی چیز ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مفت پاس مل جائے۔ ورنہ اس کے دیکھنے سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔

نوٹ

مندرجہ بالا مضمون کے کیرکٹر حاجی لق لق کے سوا سب فرضی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب یا صاحبہ اس مضمون کے کسی حصے کو اپنے اوپر چسپاں کر لیں گے تو ہم اسے اکھیڑنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

ختم شد